آپکے فہم دین کا مصدر کیا ہے

تالیف: حامد کمال الدین



آپ کے

فہمِ دین کا مصدر

کیا ہے؟

آپ کے
فہمِ دین کا مصدر
کیا ہے؟

حامد کمال الدین

مطبوعات ایقاظ

تاریخ طباعت: ربیع الاول ۱۴۲۹ھ، مارچ ۲۰۰۸ء

عنوان: آپ کے فہمِ دین کا مصدر کیا ہے؟

مؤلف: حامد کمال الدین

hamidateeqaz@gmail.com

ناشر: مطبوعات ایقاظ

برائے رابطہ و وی پی:

مطبوعاتِ ایقاظ

336 D سبزہ زار، لاہور

Ph: 042-7530541 / 0323-4031634

www.eeqaz.com

'اتباعِ حق' کا عمل اس امت کے اندر اس قدر تسلسل کے ساتھ ہوا ہے اور نسل در نسل اور کڑی در کڑی اس شدید حد تک مربوط ہے اور کہیں رکے یا روپوش ہوئے بغیر اصحابِ رسول اللہ سے سیدھا بے ساختہ یوں جا ملتا ہے، کہ 'پہلوں' کے ذخیروں سے ایک بات کا ثبوت نہ دیا جا سکنا اور ایک مکتبِ فکر کا محض 'تحقیق' کے نتیجے میں سامنے آ جانا اس کے محدَث اور 'فَھُوَ رَدٌّ' ہونے پر مہرِ تصدیق کی حیثیت رکھتا ہے۔

ائمۂ اہلِ سنت نے کیا سچ کہا، انقطاع _ یعنی دین کی کسی تعبیر کا پورے ایک تسلسل کے ساتھ پیچھے نہ جا سکنا _ اس کے باطل ہونے کیلئے کافی اور بجائے خود ایک دلیل ہے۔

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ
أما بعد

پیش لفظ

چند برس پیشتر، سہ ماہی ایقاظ میں 'اداریوں' کی صورت، ہم نے ''تبدیلی'' کے کچھ بنیادی موضوعات پر قلم اٹھانے کا ارادہ باندھا تھا، جس پر کہ مختلف پہلوؤں سے اب تک عمل جاری ہے اور خدا کو منظور رہا تو یہ سلسلہ ابھی چلتا بھی رہے گا......

''تبدیلی'' کے ان موضوعات میں ایک اہم اور بنیادی مضمون، فہمِ دین کے معاملہ میں مرجعیت اور کسوٹی کا تعین ہے جس پر کہ ذہنوں میں یکسوئی پیدا کی جانا، آپ اتفاق کریں گے، بے حد ضروری ہے بلکہ اس حوالے سے اپنے ماحول میں سرگردانی حد سے بڑھ کر پائی جاتی ہے۔

اس مضمون کے ایضاح کیلئے دو اداریے قلمبند کئے گئے تھے: ایک، ''آپ نے دین کہاں سے سمجھا ہے؟'' اور دوسرا، ''آپ کے فہمِ دین کا مصدر کیا ہے؟'' ان دو طویل مضامین کو کچھ مزید اضافوں اور ایک ترتیب نو کے ساتھ اب ایک کتابچے کی شکل میں سامنے لایا جا رہا ہے، جس سے امید ہے قاری اس موضوع کو زیادہ دِقتِ نظر اور ترکیزِ توجہ کے ساتھ دیکھنے اور اس کے کچھ اہم جوانب پہ مزید غور وخوض کرنے میں مدد پائے گا۔ تاثرات اور ملاحظات کیلئے ہم ہمیشہ ہی چشم براہ ہیں۔ اس موضوع پر سوالات کا پیدا ہونا ایک خوش آئند بات ہوگی، جن پر گفتگو کیلئے ہم ''ایقاظ'' کے ساتھ آپ کی خدمت میں حسب توفیق حاضر رہیں گے۔ لہٰذا جو اصحاب اس بحث کو مثبت انداز میں مزید آگے بڑھانا چاہیں، ہم ان کے ساتھ چلنے کیلئے بشرطِ استطاعت کوشاں رہیں گے۔

اس موضوع کی جو کئی ایک جہتیں ہیں وہ آپ کتابچہ کے اندر ہی ملاحظہ فرمالیں گے۔ یہاں ہم یہ واضح کردینا چاہیں گے کہ ہمارا یہ سارا تحریری سلسلہ دراصل ایک ایسے ''تحریکی عمل'' کی راہ ہموار کرنے کیلئے ہے جس کے کچھ بے حد زوردار امکانات، ہم سمجھتے ہیں، ہمارے برصغیر کی اسلامی دنیا کے اندر بڑی دیر سے کروٹ لے رہے ہیں اور جس کے راستے کی چند بے تکی رکاوٹیں ہٹادی جانا ہمارے خیال میں اس عمل کو ایک زبردست راہ پر ڈال دینے کی مؤثر امکانی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ''تحریکی عمل'' یہاں کن طبقوں کے ملنے سے برپا ہوگا اور اس کی صورت کیونکر نکھر سکتی ہے اور اس میں زور کیونکر لایا جاسکتا ہے؟ اس سوال کے کئی پہلو ہیں، جن کو ہم ''تبدیلی کے موضوعات'' کا نام دیتے ہیں، اور جن میں سے ایک پہلو آپ ہمارے اس کتابچے میں زیر بحث پائیں گے۔

''تبدیلی'' کے ان موضوعات کو ہم ''جہاد کی سمت'' کے زیرعنوان، سلسلہ وار کتابچوں کی صورت لانے کا ارادہ رکھتے تھے ___ 'جہاد' اپنے اس وسیع تر معنیٰ میں جو اللہ کی مدد سے یہاں ایک صالح و بنیادی تبدیلی کی اساس بنے گا اور اندرونی و بیرونی محاذوں پر باطل کے ساتھ یہاں وہ چومکھی لڑے گا جو ایک بڑی سطح پر عرصہ سے اپنے یہاں موقوف ہے اور وقت ہے کہ شدت سے اس کا منتظر! ___ ہمارے 'اداریوں' کا یہ سلسلہ بنیادی طور پر اسی ''سمت'' کو اجاگر کرنے کی ایک کوشش ہے، اور بالآخر یہ سلسلہ اسی نام سے شائع ہوگا (انشاء اللہ)۔ البتہ اس کی وہ ترتیب جو ہمارے پیش نظر ہے اس سے ہٹ کر، کچھ قارئین کے اصرار پر، یہ مضمون فی الحال اسی علیحدہ عنوان سے شائع کیا جارہا ہے۔

اب چونکہ یہ سب تحریری محنت، یہاں مطلوب ''تحریکی عمل'' کو ایک علمی اور فکری بنیاد فراہم کرنے کیلئے ہورہی ہے...... اور یہ سب لکھنا لکھانا ہمارے لئے مجرد انداز کی کوئی 'فکری' اور 'فلسفی' وقت گزاری نہیں، ہم بہر حال اپنی یہ ناچیز محنت مسلم ہند کے اندر ''جہادِ کبیر'' کا راستہ صاف کرنے کے اس مبارک عمل میں اپنا حقیر سا

ایک حصہ ڈالنے کی نیت سے ہی انجام دے رہے ہیں......

لہٰذا 'فہمِ شریعت' اور 'فقہِ دین' کے حوالے سے آپ ہمارے یہاں کچھ 'تحریکی موضوعات' کا تذکرہ بھی ساتھ ساتھ پائیں گے۔

'فہم' اور 'استدلال' ایسے فقہی موضوعات جن حضرات کے زیر مطالعہ رہے ہوں ان کیلئے ہوسکتا ہے ہمارا ان 'تحریکی' جہتوں کو بھی ساتھ لے کر بیٹھ جانا کچھ معمول سے ہٹ کر ہو، بلکہ بعید نہیں عجیب ہو! مگر ہم چونکہ اپنا ایک متعین ہدف رکھتے ہیں اور 'تحریکی' سمت میں ہی اذہان کے اندر ایک یکسوئی لانے کیلئے یہ تحریری کام سامنے لایا جا رہا ہے بلکہ ہمارے لئے یہ چیز ''ترجیحات'' کا درجہ رکھتی ہے...... لہٰذا اس پہلو کا تذکرہ و اعادہ ہمارے ہاں اگر آپ کو بکثرت ملے اور آپ کی نظر میں کتابچہ کے 'عنوان' سے یہ بات مطابقت نہ رکھے، تو اپنی پسند اور موافقت کے معاملہ میں تو یقیناً آپ آزاد ہوں گے، البتہ ہم ملتمس ہوں گے کہ ہماری یہ وضاحت بھی ساتھ میں پیش نظر رکھی جائے۔

اللهم أرِنا الحقَّ حقاً و ارزقنا اتباعه، و أرِنا الباطلَ باطلاً و ارزقنا اجتنابه، و صلى الله على النبی و آله

حامد کمال الدین

دائرۂ بحث

اصولِ اہلسنت میں عموماً جو سب سے پہلا موضوع دیکھنے کو ملتا ہے وہ ہے مصدرِ تلقِّي اور منهج تلقِّي۔ کیونکہ انہی دو باتوں پر پھر دین کے سب مسائل کا انحصار ہوتا ہے۔

مصدر تلقِّي کا مطلب ہے: دین کہاں سے لینا ہے۔

اور منهج تلقِّي کا مطلب ہے: دین کس طرح لینا ہے۔

صرف اول الذکر کو لینا اور ثانی الذکر کو نظر انداز کر دینا کچھ عظیم مغالطوں اور بڑے بڑے انحرافات کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو خدا کا شکر ہے کہ مصدر تلقّی پر ___ آج کے یہاں کے اہلسنت طبقوں میں ___ ہنوز اتفاق پایا جاتا ہے کہ صاف صاف یہ کتاب اللہ ہے اور یا پھر سنت رسول اللہﷺ۔ جو اس پر متفق نہیں وہ اہلسنت کے دائرہ میں ہی نہیں آتا۔

رہا اس تَلَقِّي کا منہج تو اس پر بہت کچھ بات ہونے کی ضرورت ہے اور اس موضوع پر پیچیدگی بھی حد سے بڑھ کر پائی جاتی ہے۔ دین کا ''مصدر'' بیشتر طبقوں پر واضح ہے مگر دین کا ''فہم'' لیا کہاں سے جائے ___ جو کہ منهج تلقِّي کا ایک موضوع ہے ___ تو اس بابت کئی ایک غلطی ہائے مضامین ہیں جو شاید ہم میں سے بہت سوں پر واضح نہیں۔ یہ مؤخر الذکر مسئلہ ہی ہمارے اس کتابچہ کا موضوع ہے۔

□□□□□□

'مرجعیت' اس وقت تحریکوں کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ تحریکی نوجوانوں کی حیرانی اور سرگردانی کا ایک بڑا باعث ہے۔ خود قیادتوں کیلئے یہ ایک پریشان کن اور غور طلب بات

ہونی چاہیے بلکہ بعض کے ہاں ہے بھی۔ 'تبدیلی' کے موضوعات میں بہر حال یہ بھی ایک بڑا موضوع ہے، یعنی:

'آپ کے فہم دین کا مصدر کیا ہے؟'

واضح رہے ہم یہاں 'دین کے مصدر' کی بات نہیں کر رہے بلکہ 'فہمِ دین کے مصدر' کی بات کر رہے ہیں۔ شاید ہمارا یہ سوال اٹھانا کچھ دیر کیلئے آپ کو عجیب بھی لگے، پھر بھی ہماری درخواست ہوگی کہ کچھ دیر آپ اس پر غور کرنے میں ہمارا ساتھ دیں۔

جہاں تک 'دین کے مصدر' کی بات ہے، تو اس معاملہ میں ہمارے یہاں بیشتر دینی وتحریکی طبقے مجموعی طور پر الحمدللہ اہلسنت کے دائرہ سے وابستہ ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہﷺ کی آئینی وشرعی حیثیت ان کے ہاں کبھی محل نظر نہیں رہی۔ فہم کی بات الگ ہے، جس پر بحث آگے آ رہی ہے، کتاب اللہ یا سنت رسول اللہﷺ کو رد کر دینے کا رجحان البتہ ان کے ہاں نہیں پایا گیا۔ 'مصدریت' ان بیشتر طبقوں کے ہاں قطعی طور پر نصوصِ وحی کو ہی حاصل ہے۔ سب کے نزدیک ہی دین دراصل قرآن اور حدیث ہے، اس کے علاوہ اِن کا عقیدہ ہے کہ بشر کی ہدایت کیلئے کچھ اور آسمان سے نہیں اترا۔

کسی گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ واضح کر دیا جانا ضروری ہوتا ہے کہ یہ کس طبقے کے ساتھ مخصوص ہے......

ہماری یہ ساری گفتگو اس تحریکی اور تربیتی اور فکری دنیا کیلئے ہے جو مجموعی اور اصولی طور پر اہلسنت کے دائرہ سے وابستہ ہے اور جس کے ہاں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہﷺ ہرگز کوئی اختلافی حیثیت نہیں رکھتے۔ مذاہب اربعہ یعنی احناف، شوافع، مالکیہ اور حنابلہ (جبکہ ہمارے برصغیر میں مذاہب اربعہ میں سے ایک بڑی سطح پر صرف احناف پائے جاتے ہیں اور یا پھر محدودسی سطح پر، خصوصاً ہمارے جنوبی ساحلوں پر، شوافع)، علاوہ ازیں اہل الحدیث واہل الظاھر وغیرہ (جن کی ایک معتد بہ تعداد برصغیر کے اندر پائی جاتی ہے)...... یہ سب ''مصادرِ دین'' کی بابت کوئی بہت بنیادی اختلاف نہیں رکھتے، اور اس

بنا پر یہ سب کے سب اہلسنت میں آتے ہیں۔ ان کے مصادرِ دین کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ؐ اور اجماعِ امت ہیں البتہ ان مصادر سے فہم وفقہ لینے میں ان کے مابین ایک تنوع پایا جاتا ہے جو کہ جب تک صحت مندرہا اور بلاشبہہ کئی صدیاں ایسا رہا امت کی فقہی تاریخ کے ایک قابل رشک واقعے کے طور پر دیکھا گیا، گو کہ اس تنوع کے اندران آخری زمانوں میں آکراب بڑی سطح پر ایک اضطراب بھی پایا جانے لگا ہے بلکہ یہ 'تنوع' بڑی حدتک اب ایک 'تضاد' کی صورت دھار گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی صورت درست کرنا اب بے حد ضروری ہوگیا ہے، بلکہ بڑی حدتک ہمارے اس کتابچہ کا موضوع بھی۔

المختصر، یہ سب طبقے معتبر علمائے امت کی نگاہ میں اہل سنت کے اندر آتے ہیں......

پس اپنی گفتگو میں ہم اس دائرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ یعنی ہمارا اصل خطاب انہی طبقوں سے رہے گا جو اپنی تاریخی وابستگی کے لحاظ سے اور مصادرِ دین کے حوالے سے اہل سنت شمار ہوتے ہیں۔ انہی کے عمل میں ایک وحدت اور یکسوئی لانا ہمارا مقصود ہے اور ہمارے اس کتابچہ کا مطالعہ کرلینے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ یہی دائرہ جو ہمارے اسلامی برصغیر کے اندر بلاشبہہ ہمیں حاصل ہے، فکری حوالے سے کچھ تھوڑا سا بنیادی کام اور ایک ترتیبِ نو کرلینے کی صورت میں، ہمیں ایک عظیم الشان تحریکی بنیاد فراہم کرکے دیتا ہے اور عمل و جہاد کی دنیا میں ہماری پیش قدمی کیلئے ایک ایسی زبردست زمین جو ہند کو پھر سے اسلام کی عالمی قوت کا ایک عظیم ستون بنادے۔

لہٰذا ہمارا اولین خطاب انہی اہل سنت طبقوں سے ہے جو کہ بڑی حدتک ہمارا ایک بنا بنایا اثاثہ ہے، بشرطیکہ کچھ کام اس کو ایک بنیادی جہت دے لینے پر کرلیا جائے، اور ہمارا یہ سب لکھنا لکھانا جس کا کہ ادنیٰ سا ایک حصہ ہے۔

رہے وہ طبقے جو ہمارے ساتھ اس اصل پر ہی متفق نہیں اور جن کے لئے مرجع کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ اس طرح نہیں جس طرح کہ اہلسنت کے ہاں ہے مثلاً

روافض، خوارج، معتزلہ، صوفیا کے باطنی مذاہب[1]، منکرین حدیث، نیچرسٹ اور سیکولر وغیرہ ایسے افکار کے پیروکار، جو کہ ہمارے ساتھ 'مصادر دین' پر ہی متفق نہیں، تو وہ ہماری اس گفتگو کے اولین مخاطب نہ ہوں گے۔ کیونکہ ہمارے اور ان کے مابین ایک اصولی اور بنیادی اختلاف کی دیوار حائل ہے اور کسی ایک فریق کے اس کو پار کئے بغیر مفاہمت ممکن نہیں۔ اس طبقہ کے ساتھ گفت وشنید بھی ضرور ہونی چاہیے اور بلاشبہہ اس طبقہ میں بھی بہت سے مثبت سوچ رکھنے والے اصحاب پائے جاسکتے ہیں، اور ہمارے اس مضمون میں بھی ان کے غور وفکر کیلئے بہت کچھ ہوگا، مگر مصادرِ دین پر اتفاق کے معاملہ میں ان سے بات کرنے کیلئے بہر حال کوئی اور موقعہ درکار ہوگا اور ایک مختلف اپروچ۔

سو یہ واضح رہے کہ وہ سب قدیم اور جدید طبقے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کو دین کا قطعی اور حتمی مصدر نہیں مانتے اور زندگی کے ہر ہر معاملے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کو 'حَکَم' اور دین ودنیا کے ہر ہر شعبے میں اس کو فیصل تسلیم نہیں کرتے، خواہ وہ 'شریعت' اور 'طریقت' میں امتیاز کے زیر عنوان ہو، یا باطنیت کے پردے میں، یا عقل اور فلسفہ اور نیچر کی تحکیم کے تحت، یا سیکولر بنتے ہوئے دین ودنیا کی تقسیم کے تحت...... اور جو کہ اہلسنت ہی شمار نہیں ہوتے، تو یہ طبقہ ہماری اس گفتگو کا براہ راست اور اولین مخاطب نہیں۔ گو ان کے لئے بھی اس مضمون میں کوئی کام کی بات پائی جاسکتی ہے۔

البتہ اہل سنت طبقوں کی ایک کثیر تعداد، خصوصاً یہاں کے سنجیدہ دیندار اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے، چونکہ برصغیر کے روایتی حلقوں کے اندر پائے جانے والے جمود سے تنگ آکر، اور ایک صحیح علمی وفکری راہنمائی کے معاملے میں پائے جانے والے خلا کے باعث، یہاں کے جدت پسند رجحانات کی طرف کچھ میلان کر لینے پر 'مجبور' سے ہوئے ہیں اور اس وقت یہ صورتحال ہے کہ ان میں سے کوئی کہیں کھڑا ہے تو کوئی کہیں، البتہ

---

(۱) یعنی صوفیاء کے وہ طبقے جو 'شریعت اور طریقت' میں فرق کرتے ہوئے 'طریقت' کو مقدم اور 'شریعت' کو مؤخر کردیتے ہیں۔ رہے صوفیاء کے وہ طبقے جو پابند شریعت ہیں اور شرک سے دامن کش رہتے ہیں، تو بلاشبہہ وہ اہل سنت میں آتے ہیں۔

ایک عدم اطمینان کی کیفیت سے عموماً باہر نہیں جبکہ اہلسنت کے ہاں مانے جانے والے مصادر دین سے انکی وابستگی بھی الحمدللہ ختم نہیں ہو پائی بے شک وہ جدت پسندوں کے افکار کو کتنا ہی سنتے پڑھتے ہوں اور حتیٰ کہ ان سے متاثر بھی کیوں نہ ہوں...... یہ طبقہ سمجھئے ہماری اس پوری گفتگو کا اہم ترین مخاطب ہے۔ بہت جگہوں پر ہمارے ہاں جدت پسند رجحانات پر کچھ گفتگو پائی جائے گی تو دراصل وہ ہمارے ان اپنے ہی اصحاب کے فائدے کیلئے ہوگی اور اس کا مقصد اپنے انہی اصحاب کا ''اصولِ اہل سنت'' پر اعتماد بڑھانا ہوگا۔

□□□□□□

آپ کے فہم دین کا مصدر کیا ہے؟

اس کا سیدھا جواب کچھ قابل احترام طبقوں کی طرف سے یہ ملتا ہے کہ:

''قرآن اور حدیث''۔

قرآن اور حدیث سے بڑھ کر حق بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ قرآن وحدیث کے سوا حق کا کوئی پیمانہ اپنے پاس اور رہتی دنیا تک پوری انسانیت کے پاس کوئی نہیں۔ دین کے حقائق وحی کی انہی نصوص میں محفوظ ہیں اور قیامت تک محفوظ ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے سوا علم حقیقی کا کوئی مصدر ہے ہی نہیں۔

مگر مسئلہ سوال کی نوعیت کا ہے۔ سوال کا مقصود متعین کئے بغیر جواب دے دیا جانا بسا اوقات الجھن بڑھا دینے کا سبب ہوتا ہے نہ کہ الجھن کا حل۔ اس سوال کے ساتھ بھی بعض طبقوں کی جانب سے یہی معاملہ ہوتا ہے۔ 'دین' اور 'قرآن وحدیث' دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ یہ ایک ہی چیز ہے۔ آپ نے دین 'قرآن وحدیث' سے سمجھا ہے تو زیادہ واضح ہونے کیلئے ہم یہ سوال یوں رکھ لیتے ہیں کہ: ''آپ نے قرآن اور حدیث کو کہاں سے سمجھا ہے؟''

یہ سوال البتہ واقعتاً غور طلب ہے اور توجہ طلب۔

'قرآن اور حدیث' تو خود بخود واضح ہیں۔ اس کو 'کہیں' سے سمجھنے کا کیا سوال؟' یہ ایک اندازِ فکر ہے اور اس کی تہہ میں جانا موضوعِ زیرِ بحث کو واضح کر دینے کیلئے کسی حد تک ضروری۔ گو آئندہ فصول میں ہم بعض دیگر انداز ہائے فکر پر بھی مفصل گفتگو کریں گے۔

قرآن اور حدیث دین کا اصل مصدر ہیں۔ بلکہ دین ہیں۔ یہ بات ہر بحث اور ہر شبہہ سے بالاتر ہے۔ اس کے سوا خدا نے انسانوں کی ہدایت کیلئے اپنے رسولؐ پر کچھ نہیں اتارا۔ دین کا یہ منبع محکم ہے اور اپنے آپ میں بے انتہا واضح۔ مگر پھر بھی اس کی ''تفسیر'' اور ''بیان'' ایک با قاعدہ علم ہے اور اس علم کو درست طور پر جاننے اور سمجھنے والے تاریخی طور پر کچھ متعین لوگ ہیں۔

یوں تو خدا کی یہ کائنات بھی ایک کھلی کتاب ہے۔ ان کو بھی کتاب اللہ میں خدا کی آیات کہا گیا ہے۔ بلا شبہ یہ ایک واضح کتاب ہے۔ ہر کوئی اس کو پڑھ سکتا اور اس سے فوائد کشید کر سکتا ہے۔ کسی پر بھی پابندی نہیں۔ کتابِ کائنات سے فوائد کشید کرنے کے بے شمار پہلو ہیں۔ کچھ ایمانی ہیں اور کچھ واقعاتی۔ کائنات کو واقعاتی انداز میں پڑھنے کا ایک پہلو 'سائنس' کہلاتا ہے۔ 'سائنس' کائنات کی بابت کئے گئے انسانی تجربات اور مشاہدات کا نام ہے۔ مگر 'کائنات' سے 'سائنس' کی کشید کے معاملے میں بھی کیا سب لوگ برابر ہیں؟ کیا اس کا علم کچھ مخصوص مصادر سے لیا جانا ضروری نہیں؟ تجربے اور مشاہدے کی بابت کچھ خاص متعین اصول نہیں؟ سائنس کی وادی میں آکر کیا ہر کسی کو اپنا ''پہیہ'' ایجاد کرنا ہوتا ہے یا 'پہیے' کی بابت پہلے سے جاری عمل کو لے کر ہی آگے بڑھانا ضروری ہوتا ہے؟ سائنس کی بابت آدمی کو کیا کسی تاریخی تسلسل کا حصہ بننا ہوتا ہے یا اس سے الگ تھلگ رہ کر ہی کائنات کے حقائق کو 'از سر نو' دیکھنا اور پرکھنا ہوتا ہے؟ کائنات تو وہی کائنات ہے جو دس ہزار پہلے تھی۔ مگر کائنات کو پڑھنے کا عمل ایک تاریخی تسلسل ہے اور اب اس کے کچھ خاص قواعد وضوابط ہیں اور کچھ متعین مراجع، جن سے منقطع رہنا ہرگز کوئی علمی رویہ نہیں۔

ضروری نہیں یہ مثال 'دین کے علم' کے معاملہ سے سو فیصد مطابقت رکھتی ہو۔ مگر یہ اس سے سو فیصد متعارض بھی نہیں۔ ان دونوں معاملوں کا مشترکہ پہلو ہی دراصل اس مثال سے ہمارا مقصود ہے۔

بنا بریں، یہ بات کہ قرآن وحدیث اپنے آپ واضح ہیں، اس بات سے متعارض نہیں کہ قرآن اور حدیث کو پڑھنے اور سمجھنے کا ایک درست طریق کار ہی اختیار کیا جائے اور اس کے فہم کے معاملہ میں صرف اور صرف درست "مراجع" پر ہی انحصار کیا جائے۔ یہ "درست مراجع" ہی چنانچہ ہماری اس گفتگو کا اصل موضوع ہے۔ 'مرجعیت' آج کے تحریکی اور اصلاحی عمل کی راہ میں واقعتاً ایک اہم سوال اور ایک وضاحت طلب مسئلہ ہے اور اس سے صرف نظر کرنا ایک بہت بڑے فرض کو تشنۂ تکمیل چھوڑ دینا۔

□□□□□□

تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارے وہ طبقے جو قرآن اور حدیث کے فہم کیلئے ___ واضح رہے "فہم" کے لئے ___ کسی خاص مراجع اور ضوابط کا اپنے آپ کو ضرورت مند نہیں جانتے، کیونکہ 'کتاب اور سنت کے خود بخود واضح ہونے' سے ان کے ہاں یہی مراد لی جاتی ہے...... یہ کسی دوسرے کو اپنے سے مختلف استدلال کرتا دیکھیں ___ گو وہ قرآن اور حدیث سے ہی استدلال کر رہا ہو ___ تو اس کو شدت سے مسترد بھی کرتے ہیں!

برصغیر میں خصوصاً پچھلی پانچ سات دہائیوں سے یہ انداز فکر خاصی تیزی سے پروان چڑھا ہے۔ یعنی ہر شخص قرآن اور حدیث کو خود اپنی تحقیق کر کے سمجھے گا اور اس کے نتیجے میں چاہے پھر وہ جہاں بھی پہنچے! قرآن اور حدیث کے بے انتہا واضح ہونے کا اس کے ہاں یہی مطلب ہے کہ وہ ان کو خود سمجھ سکتا ہے! جس کیلئے سوائے عربی زبان کے (بلکہ شاید تراجمِ کتب کے) یا کچھ تھوڑا بہت 'ذاتی مطالعہ' کر لینے کے وہ کسی چیز پر انحصار کا پابند نہیں۔ اب جو اس کو سمجھ آئے اس کو حق ماننے کا بھی وہ اپنے اس انداز فکر کی رو سے خود بخود پابند ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسرے

اس قرآن اور حدیث کو اس سے مختلف انداز میں سمجھیں تو ان کو غلط جاننے کا بھی اپنے آپ کو مکلّف سمجھتا ہے!

پس اس انداز فکر کی رو سے ہر شخص قرآن اور حدیث کو خود سمجھنے کا جس قدر پابند ہے اپنے سے مختلف قرآن وحدیث سمجھنے والوں کو غلط جاننے کا بھی اتنا ہی پابند ہے!

کیا سب لوگ قرآن اور حدیث کو ایک ہی طرح سمجھ سکتے ہیں؟ کہ جب بھی ان کے سمجھنے میں فرق آئے تو ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہو؟؟؟ بلکہ درست مراجع اور صحیح ضوابط نہ ہوں تو کیا قرآن اور حدیث کو سرے سے سمجھ بھی سکتے ہیں؟؟؟ الا یہ کہ ایک چیز کا 'آپ کو حق ہے اور دوسرے کو نہیں'! یعنی عین وہ چیز جو ایک کبھی نہ ختم ہونے والے تنازعہ کی جڑ ہوا کرتی ہے! ایک چیز آپ کیلئے جائز ہے تو دوسرے کیلئے ناجائز کیوں؟ اور اس بات کی آخر کیا ضمانت ہے کہ قرآن اور حدیث سے اپنے تئیں آپ نے یا آپ کی جماعت نے جو سمجھا وہ ضرور ہی درست ہے اور دوسرے نے یا اس کی جماعت نے جو سمجھا وہ ضرور ہی غلط ہے؟ معاملہ اگر اس کے برعکس ہو تو!!؟

□□□□□□

'دین' کے مصادر اور 'فہم دین' کے مصادر ...... ان دونوں کا خلط کر دیا جانا کئی ایک پیچیدگیوں اور معضلوں کے پیدا کر دینے کا سبب بنا ہے۔ لہٰذا اس پر کچھ مزید روشنی ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔

'دین' کے مصادر اور 'فہم دین' کے مصادر گڈ مڈ ہو جانے کے باعث پیدا ہو جانے والی یہ غلط فہمی حق یہ ہے کہ محض ایک ہی طبقے میں نہیں پائی جاتی ......

ایک طرف آپ دیکھتے ہیں کہ دین کا مصدر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو ماننے کا یہ تقاضا سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہر وہ مصدر جس کی کتاب اور سنت کے 'فہم' کے معاملہ میں پابندی اختیار کی جانی چاہیے، اس کو کتاب اور سنت کا ہی ہم سر قرار دے کر مسترد یا نظر انداز کر دیا جائے۔

آیات اور احادیث کے فہم اور تطبیق کی بابت چنانچہ جب آپ لوگوں کو صحابہ یا تابعین و اتباع تابعین کے راستے کا پابند کرتے ہیں یا جب اس راستے کا علم رکھنے والے ائمۂ علم و فقہ کے مراجع کا، ایک مجموعی معنیٰ میں، پابند رہنے کا ان سے تقاضا کرتے ہیں تو کسی وقت جواب آتا ہے 'کیوں، وہ نبی ہیں؟!' جبکہ ہم ان کو سلف و ائمہ کے اقوال کا اللہ اور رسولؐ کے قول کے مقابلے میں نہیں بلکہ اللہ اور رسولؐ کے قول کے 'فہم' کے معاملے میں پابند کرارہے ہوتے ہیں، جبکہ جس قدر سلف و ائمہ کے اقوال میں تعددِ آراء کی گنجائش ہوتی ہے ہم وہ بھی ان کو پوری دے رہے ہوتے ہیں، صرف اس سے باہر جانے اور اپنی 'اَقول' سنانے سے ان کو متنبہ کرتے ہیں، اس کے باوجود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں 'اللہ اور رسولؐ' کے ماسوا دین کے کسی مرجع یا کسی ماخذ کا پابند کر رہے ہیں!

دوسری جانب وہ طبقے ہیں جو اپنے مصادر کو جن سے وہ دین کا فہم لیتے رہے ہیں، مستقل بالذات حیثیت دینے لگتے ہیں۔ یہ خاص 'اپنے' ائمہ اور 'اپنی' کتبِ فقہ کے علاوہ کہیں اور سے رجوع کیا جانے کو باطل تک سمجھنے لگتے ہیں اور انہی کے اندر وارد ہوچکے مسائل کو قیامت تک کیلئے حرف آخر۔ اس سے اختلاف ہوجانے میں یہ ہلاکت کے اندیشے تک دیکھنے لگتے ہیں چاہے وہ اختلاف کتنی ہی علمی بنیادوں پر کیا گیا ہو اور دیگر مستند ائمۂ دین سے اس کا ثبوت کیوں نہ ملتا ہو۔

پھر کسی وقت کتاب اور سنت کے ساتھ، جو کہ دین کے ابدی مصادر ہیں، انکے اختیار کردہ مراجع کا صاف تعارض بھی پایا جائے، جو کہ کسی خاص متعین امام یا عالم کے حق میں بہر حال ممکن ہے، گو وہ عنداللہ اس پر جوابدہ نہ ہوگا، بلکہ تو کبار صحابہ تک سے ایسے اقوال یا افعال صادر ہوجانا محال نہیں جو کتاب اور سنت کے ساتھ مطابقت رکھنے میں پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتے ہوں اور ان اقوال کے مقابلہ میں کچھ دیگر صحابہ و اہل علم کے اقوال ہی حق کے موافق تر ہوں، مگر یہاں بھی یہ 'اپنے' مراجعِ فہم کو

اسی طرح واجب اتباع قرار دیں گے جیسا کہ ان معاملات میں جہاں ان کے یہ مراجع کتاب وسنت سے متعارض نہیں۔ یوں کچھ ائمۂ علم وفقہ، جن سے رجوع کیا جانا بلا شبہہ ضروری ہے، اس طبقہ کے لئے البتہ 'فہم دین' کے مصدر نہیں بلکہ خود 'دین' ہی کے مصادر بن جاتے ہیں۔

گویا یہ خلط دونوں طرف برابر پایا جاتا ہے: 'دین کا مصدر' اور 'دین کے فہم کا مصدر'۔

تیسری طرف ایک الجھی ہوئی ذہنیت ہے۔ یہ قرونِ سلف کو ویسے ہی کسی خاطر میں لانا امور دِین کے فہم واستنباط کے معاملہ میں اپنے اوپر گراں سمجھتی ہے بلکہ شاید اپنے مرتبہ ومقام سے فروتر اور اس سلسلہ میں سلف کے فہم کی پابندی کو اپنے کھل کھیلنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ۔ اس 'آزادی' کے باعث، اس طبقہ میں اب ایک سے ایک نیا رجحان آرہا ہے، حتیٰ کہ ایک ہی محقق کی زندگی میں ہر چند سال بعد فکر کا ایک نیا تر ماڈل آجاتا ہے جس کو وہ 'تحقیقی دیانت' کے تحت خود ماننا اور جرات کرکے خلق خدا کے سامنے لانا قریب قریب اسی اخلاص کے ساتھ ضروری سمجھتا ہے جس تجرد ولاپروائی کے ساتھ ایک نبی اپنے اوپر اترنے والے 'ناسخ ومنسوخ' کو اپنی امت تک پہنچانے کا ہر حال میں پابند ہوا کرتا تھا! امت کا فرض ہے کہ ان محققین پر نگاہ مرکوز رکھے کہ کب ان کے سفر میں اچانک کوئی نیا موڑ آجاتا ہے اور کب اصولِ دین کے معاملے میں ان پر یکلخت کوئی نئ دلیل یا کوئی نئ توجیہ منکشف ہوتی ہے تاکہ 'حق' کو 'تسلیم' کرتے جانے' یا کم از کم زیر بحث 'لائے رکھنے' میں امت کسی وقت تقصیر کی مرتکب نہ ہوجائے...... اور 'دین کے بنیادی امور میں تحقیق' کے مشن پر روانہ کسی صاحبِ فکر کا 'قبلہ' کسی وقت تھوڑا بہت سرک جاتا ہے تو 'دلیل' کے پیچھے چلنے کا عمل تعطل یا خلل کا شکار نہ ہو!

یہاں تک کہ اس طبقہ میں مسئلہ کسی بھی وقت 'اصولِ فہم' سے نکل کر 'مصادرِ دین' کی حدود میں بھی داخل ہوجاتا ہے اور 'کتاب' اور 'سنت' کی تعریف تک میں بہت کچھ 'نیا'

سامنے آ جانے کا انکے یہاں امکان رہتا ہے۔ اپنے عمومی مسلک میں یہ طبقہ اہلسنت میں شمار ہونا بھی مشکل ہے، کیونکہ اس کے ساتھ 'مصادر' کے معاملہ میں ہی کوئی مشترک و قابلِ اعتماد زمین ہمارے اور ان کے اکٹھا چلنے کیلئے میسر نہیں رہتی اور بات بات پر ہر دو فریق کے مابین 'وضاحت در وضاحت' اور 'استیضاح در استیضاح' کی ضرورت پڑی رہتی ہے اور حیرت یہ کہ مسلسل بڑھتی جا رہی ہے،...... حالانکہ نزاع اصولِ دین کے گرد ہے، جو کہ امت کے وسیع طبقوں میں پیشگی واضح اور معلوم سمجھی جانے والی چیز ہونی چاہیے، جبکہ یہاں کئی ایک 'محققین' کو یہ گلہ رہتا ہے کہ 'میری بات سمجھی نہیں جا رہی اور ایک بے حد محدود تعداد ہی کو 'سمجھ' آ رہی ہے'!...... اور چونکہ فریقِ دیگر کا سفر و نقل مکانی مسلسل جاری ہے اس لئے کئی 'وضاحتوں' کی میعاد expiry date تک ختم ہو چکی ہوتی ہے اور کئی پرانے 'اسٹیشن' بھی متروک ٹھہرائے جا چکے ہوتے ہیں۔ مراجعِ فہم کا پس کیا رونا، مصادرِ دین تک کے معاملہ میں 'نئے' کا امکان مسلسل یہاں موجود رہتا ہے!

تاہم چونکہ "فہم" کے ساتھ بھی ان لوگوں کا مسئلہ کسی نہ کسی حد تک متعلقہ ہے، پھر مآخذ کے معاملہ میں بھی ہماری یہی گفتگو ان سے متاثر ہونے والوں کے غور و فکر کیلئے کئی ایک راہیں کھول سکتی ہے...... لہٰذا اس فریق کے فائدہ کی بھی کئی ایک باتیں ان شاء اللہ یہاں آئیں گی۔

□□□□□□

ایک بے قابو مجمع!

جس امت کو ایک بڑی سطح پر داخلی یکسوئی حاصل نہ ہو وہ اپنے دشمن کے مدمقابل کونسا معرکہ سرانجام دے سکتی ہے؟ چنانچہ اب ایک عرصے سے ہمارے آپس کے 'معرکوں' کا ہی بازار گرم ہے جس میں کمی آنے کا تو سوال بھی 'عجیب' لگتا ہے البتہ اس میں تیزی روز بروز آ رہی ہے!

غور طلب بات یہ ہے کہ دشمن کے مدمقابل ہمارا جو اصل ہتھیار تھا وہ ہمارا فکر وعقیدہ ہی تھا اور ہمارے دین کے بنیادی تصورات۔ برتری قائم رکھنے کے معاملہ میں یہی ہمارا اصل میدان تھا اور اسی میں ہم دشمن کو بآسانی مات دے سکتے تھے۔ مگر یہی میدان ہمارا آپس کا کارزار بنے تو دشمن کے مدمقابل ہم کس کام کے! یہی وجہ ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں کسی بڑی سطح پر ہم نے کچھ محنت اور ہمت کرکے دشمن کے خلاف بندوق اٹھائی ہو تو اٹھائی ہو مگر فکر کے ہتھیار کسی بڑی سطح پر استعمال نہ کر سکے۔ جبکہ معاملہ کیا ہے؟ دشمن اپنے وجود کے لحاظ سے ہم سے دور ہو تو ہو مگر اپنے فکر کے لحاظ سے وہ ہمارے اندر بیٹھا ہے بلکہ ہماری جڑوں میں بیٹھا ہے۔ ایک فکری یکسوئی اس لحاظ سے ہماری سب سے پہلی ضرورت تھی مگر ہم اس سے روز بروز دور ہو رہے ہیں اور اس بات پر ہی مصر، کہ یہ معرکہ زیادہ سے زیادہ کوئی بندوق اور توپ کا معرکہ ہے۔

□□□□□□

اتفاق اور اختلاف کے ضوابط اور مراجع اس لحاظ سے ہماری ایک بہت بڑی اور بنیادی ضرورت ہے۔ دین کے فہم کی بابت ایک ایسی بنیاد جو درست بھی ہو اور امت

کے ایک معتد بہ طبقے کے مابین مشترک بھی، اس کو اپنی سب سے پہلی ضرورت کہیں تو شاید غلط نہ ہو۔

اس سلسلہ میں ''ضوابط'' یہاں ہمارا موضوع نہیں اور درحقیقت اس کا انحصار بھی بڑی حد تک ''مراجع'' پر ہی ہے۔ 'مراجع' درست ہو جائیں تو 'ضوابط' کا صحیح ہونا آپ سے آپ ممکن ہو جاتا ہے اور توفیق تو ہر معاملہ میں بہرحال خدا سے ہی طلب کرنا ہوتی ہے۔

حتی کہ 'فہم واستدلال کے ضوابط' ہی نہیں بلکہ 'فہم واستدلال کی بابت اتفاق واختلاف آراء کے ضوابط' کا درست ہونا بھی درست ''مراجع'' اختیار کر لینے کے بعد ہی ممکن ہے۔

اس لحاظ سے یہ مسئلہ بے انتہا اہم ہو جاتا ہے۔

□□□□□□

اللہ تعالیٰ نے یہ دین نازل کیا تو 'افراد' کیلئے نازل نہیں کیا۔ یہ دین 'جماعتوں' کیلئے نازل نہیں ہوا۔ یہ ایک ''امت'' بنانے اور ایک ''امت'' کو چلانے کیلئے اترا ہے۔ اس کا یہی قد کاٹھ ذہن میں رہنا ضروری ہے۔ اس کا یہی مرتبہ دلوں میں جانشین کرایا جانا چاہیے۔

یہاں ایک آدمی اٹھے۔ وہ اپنا 'حاصلِ مطالعہ' لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ 'گہرے غور وخوض' کے بعد وہ اسلام کی ایک تعبیر متعارف کرائے۔ 'کتاب وسنت' سے اس کے ثبوت دے۔ کچھ لوگوں کو وہ 'ثبوت' نظر آئیں اور وہ اس کے ساتھ ہو لیں اور اس کی دعوت کو کتاب اور سنت کا تقاضا سمجھیں۔ کچھ کو وہ ثبوت نظر نہ آئیں اور وہ اس کو رد کر دیں اور باطل پر سمجھیں۔ یہ اپنے اس فہمِ اسلام کو لوگوں سے منواتا اور اس کے ثبوت دیتا اور لوگوں کو اور اطراف سے توڑ توڑ کر اپنے ساتھ شامل کرتا دنیا سے رخصت ہو جائے اور پسماندگان کو ''مشن جاری رکھنے'' کی وصیت کر جائے۔ کچھ اس کو جاری رکھ پائیں اور کچھ ہمت چھوڑ جائیں اور کچھ ذرا عرصہ بعد کسی

اور 'زندہ' دعوت میں حق کے ثبوت دیکھنے لگیں...... عالم اسلام کے ہر خطے اور ہر علاقے میں سینکڑوں کے حساب سے بیک وقت ایسے 'سلسلے' چلیں اور ہر لمحہ یہ چراغ جلتے اور بجھتے رہیں...... غرض امت کے اندر توڑ پھوڑ کا یہ عمل مسلسل اور پورے اخلاص کے ساتھ جاری رہے اور بالآخر کوئی 'جماعت' بھی 'امت' کو فتح نہ کر سکے، گو ہر جماعت ہی اس تاک میں ہو اور نیک نیتی کے ساتھ امت کا بھلا کرنے کی یہی ایک صورت جانتی ہو...... تو 'دین کے کام' یا 'دین کی دعوت اور تفہیم' یا 'دین کے قیام' کا یہ تصور اسلام کی فطرت سے بالکل ہی بیگانہ ہے۔ اس کی ضرر رسانی کے عملی شواہد بھی اب دیکھنے ہوں تو جگہ جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

کسی روزنامہ یا کسی جریدہ میں کوئی شخص دِین کے کسی موضوع پر 'اظہار خیال' کرتا ہے۔ کچھ حوالے قرآن اور حدیث کے دے لینا بھلا کیا مشکل ہے۔ اِس شخص کا اپنا مبلغ علم، خدا معلوم۔ ہو سکتا ہے محض تراجم پر انحصار کیا گیا ہو یا حتی کہ 'اُردو بازار' سے کسی بھی اچھے چھاپے کی کوئی کتاب اُٹھا کر حوالہ دے لیا گیا ہو۔ بس شرط یہ ہے کہ مضمون ذرا انداز سے باندھا گیا ہو۔ اسلوب دلچسپ ہو اور 'خیال' نیا ہو اور اس باب میں بعض 'روایتی خیالات' کو جا بجا غلط اور فرسودہ ٹھہرایا گیا ہو۔ لیجئے ایک 'تحقیق' حاضر ہے۔ اس پر جوابی تبصروں کا ایک طویل سلسلہ چل نکلے اور کئی دیگر پرچوں اور جریدوں کے صفحات کھل جائیں تو ہرگز تعجب نہ کیجئے۔ مضمون میں اگر ایک خیال پیش کیا گیا تھا تو اس پر جتنے تبصرے اور اعتراض اور جواب آئیں گے اتنے ہی خیال اس موضوع پر تب آپ کے پڑھنے کو دستیاب ہوں گے۔ خود صاحبِ مضمون جواب در جواب جو مزید خیال پیش کریں گے وہ اس پر مستزاد۔ کہاں رکا جائے؟ (ویسے رکنے کی کیا ضرورت ہے!) کہاں ٹھہرا جائے؟ کہاں پہنچا جائے؟ جہاں اخبار اس سلسلہ کو مزید جاری رکھنے اور مزید کسی مضمون کو شائع کرنے سے معذرت کر لے! اس کے بعد آپ کی انفرادی اور شخصی 'تحقیق' ہے اور اس کی کوئی حد نہیں!!!

بہت سے لوگ اُردو اور انگریزی کتب پر مشتمل اپنی ذاتی لائبریری میں بیٹھ کر (زیادہ تر ریٹائرمنٹ کی عمر میں!) دِین کے بہت سے اہم اور بنیادی اُمور پر بڑے آرام سے نہ صرف 'تحقیق' کر لیتے ہیں بلکہ اپنی اس تحقیق کا بہت ہی شدومد سے پرچار کرنے تک پر مصر ہوتے ہیں! علما تک کو ان موضوعات پر غلط ٹھہرانے اور خاموش کرانے کی فکر میں ہوتے ہیں اور بسا اوقات تو ان موضوعات پر تالیف کیلئے طبع آزمائی تک نوبت آتی ہے!

یہ درحقیقت ہمارے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ ایسے میں آپ چلیں گے بہت اور پہنچیں گے کہیں نہیں۔ سرگردانی اسی کو کہتے ہیں! اس دین کی حقیقت، اس کی فطرت اور اس کا مزاج یقیناً اس سے کہیں برگزیدہ ہے کہ اس کے ساتھ یوں تعامل کیا جائے۔

ضروری ہے کہ دین کے فہم کی بابت کچھ ایسے مستند مراجع اختیار کئے جائیں جو نہ صرف صحیح ہوں بلکہ وہ 'امت' کی سطح کے ہوں۔ صرف ایک 'فرد' یا ایک 'جماعت' کو کام دینے والے نہ ہوں بلکہ ایک فرد یا ایک جماعت کسی وقت اپنی بات چھوڑ کر اور اپنے فہم واستدلال سے دستبردار ہو کر ان پر آنے کا پابند ہو۔ ان کو اپنا کر ایک جماعت امت کی سطح پر آئے نہ کہ امت کو 'جماعت' کی سطح پر لانے کی کوشش کرے۔ ایک بڑی چیز اپنے سے چھوٹی چیز میں فٹ نہیں ہوسکتی۔ یہ کوشش درحقیقت عبث ہے۔ بڑا ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ جس طرح ایک فرد سے اس کا اپنا آپ 'جماعت' میں گم کرایا جاتا ہے اور اس کو اس بات کے بے پناہ فضائل بتائے جاتے ہیں ویسے ہی اور اتنے ہی اخلاص کے ساتھ 'جماعت' اپنا آپ 'امت' میں گم کردے۔ اس عمل کے جہاں اور بہت سے تقاضے ہیں وہاں فہم دین کیلئے کچھ ایسے مراجع کا اختیار کیا جانا بھی جو بیک وقت مستند بھی ہوں اور مشترک بھی، ازحد مطلوب ہے اور امت بننے اور بنانے کا ایک لازمی تقاضا۔

□□□□□□

ایک مجمع جہاں بہت سارے لوگ اپنی اپنی سناتے اور بیک وقت بولتے ہوں، کسی مثبت سمت میں حرکت نہیں کرسکتا۔ اس میں موجود چھوٹی چھوٹی 'ٹولیاں' اپنے اپنے انداز سے جو طریق اپنائیں گی بے شک اپنے حساب سے کسی ٹولی کا عمل کتنا ہی 'منظّم' کیوں نہ ہو مگر 'مجمع' کے لحاظ سے اس کو ایک بے ہنگم عمل ہی کہا جائے گا۔ ایسے مجمع کو اگر کوئی افتاد پڑے تو وہ اپنی اس ہیئت ترکیبی کے باعث بھاری نقصان اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

فی الوقت، اپنا یہ نقصان ہم بڑی محنت اور تن دہی کے ساتھ کرا رہے ہیں!

کسی مجمع کو شامتِ اعمال سے اگر ایسی صورت پیش آ چکی ہے، اس میں اگر کچھ سمجھدار ہیں تو بھی مجمع کا کچھ نہ کچھ نقصان ہو جانا تو بہر حال یقینی ہے۔ آپ کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کہ اس 'نقصان' کا عرصہ دراز ہو جانے کی راہ میں پوری سنجیدگی سے حائل ہوں اور معاملے کو _ رفتہ رفتہ _ بہتری کی جانب لانے کیلئے کوشاں ہو جائیں۔ جس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ آپ کوئی ایسی چیز سامنے لائیں جس کی جانب ہر فرد اور گروہ کا رجوع کر لینا ایک معقول ترین بات ہو جو کہ ظاہر ہے آپ کی اپنی بات یا اپنا ایجنڈا نہیں ہونا چاہیے ورنہ آپ بھی ٹولیوں میں سے ایک ٹولی ہوں گے اور عین وہی کام کر رہے ہونگے جو 'اپنی اپنی جانب' دعوت دے کر مجمع کو بے ہنگم رکھنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ آپ کی اپنی تفسیر اور اپنا فہم نہیں ہونا چاہیے جس کا کہ اصولاً سب کو ہی برابر حق ہے۔ یہ آپ کی اپنی بات سے بڑی کوئی چیز ہونی چاہیے جس پر سب لوگوں سے اتفاق کر لینے کا تقاضا کرنا واقعتاً ایک معقول تقاضا کہلا سکے۔ جس کے ماننے اور منوانے میں کوئی فاتح اور مفتوح نہ ہو۔ کوئی بڑا اور چھوٹا نہ ہو۔ پھر یہ کہ لوگوں کو اپنی سمجھ پر چلنے کیلئے اس میں ایک حد تک آزاد بھی چھوڑا گیا ہو۔ گو لوگوں کا آپ کی اس بات کو سمجھ لینا اور مان لینا پھر بھی ضروری نہیں کیونکہ لوگوں کے مان لینے کا تعلق خود لوگوں سے ہے اور اس بات سے ہے کہ خدا کو ان کی بھلائی کہاں تک اور

کب تک منظور ہے۔ البتہ ایک ایسا تقاضا جو بیک وقت درست بھی ہو اور سب کو ایک مشترک بنیاد پر بھی لا سکتا ہو اور جس میں کسی ایک کی جیت اور دوسرے کی ہار نہ ہو اور جو کہ لوگوں کو اس بحران سے نکال لانے اور کامیابی کی جانب گامزن کر دینے کیلئے بالفعل لازم ہو، اُن کے سامنے رکھ دینا اور اس پر انکو قائل کرنے کیلئے آخری حد تک جان کھپا دینا بہرحال لازم ہے۔ خدا کو اگر منظور ہوا اور جب منظور ہوا لوگوں کی ایک معقول تعداد کو وہ بات سمجھنے اور تسلیم کرنے کی توفیق مل جائے گی جو مجمع کو بالآخر بحران سے باہر لے آسکے اور بحران سے باہر لانے کی امکانی Potential صلاحیت رکھتی ہو۔ خدا کو منظور نہ ہوگا یا جب تک منظور نہ ہوگا تب تک افراتفری کی یہ صورتحال بہرکیف باقی رہے گی۔

صورتحال کو بالفعل بدل دینے کی ضمانت پس خدا کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ کسی انسان کے ہاتھوں نتائج کی یقین دہانی بہرحال نہیں کرائی جا سکتی...... البتہ اجتماع کا وہ درست طرز عمل اختیار کرنا جو ''اصول اہلسنت'' ہمارے لئے فراہم کرتے ہیں اور جو کہ موجودہ دور کے اہلسنت طبقوں کو یا ان کی ایک معتد بہ تعداد کو مجتمع کرنے کی واقعتاً اور معقول ترین حد تک صلاحیت رکھتی ہے، اور اس کی تبلیغ کرنا اور آخر تک کرتے رہنا، البتہ ضرور انسان پر فرض ہے۔ اس سے بڑھ کر اس معاملہ میں انسان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ ایک مجمع کا مخل اور خراب ہوتے رہنا جتنی دیر تک خدا نے لکھ رکھا ہے ___ گو اس کے اسباب اہل مجمع کے اپنے پیدا کردہ ہوں گے ___ تب تک ''صبر'' اور ''محنت'' کے سوا کچھ چارہ نہیں، بشرطیکہ ''محنت'' اور اس پر ''صبر'' کی صحیح بنیاد دریافت کر لی گئی ہو۔ اس 'درستیِ حالات' کی ضمانت دے دینا تو پس کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن اگر انسان اس عمل کا حصہ بن کر اپنا فرض ادا کر رہا ہے اور اپنی استطاعت کی حد تک عین وہ کام کر رہا ہے جو اس مجمع کو مجتمع اور یکسو کر دینے کی راہ میں، یا یوں کہیے 'مجمع' کو ''جماعت'' میں بدل دینے کی راہ میں، کر دیا جانا آدمی سے

مطلوب ہے تو مجمع پھر درست ہوتا ہے یا بدستور خراب ہوتا چلا جاتا ہے وہ شخص بہر حال ضائع نہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کا قول مشہور ہے:

الجماعة ماوا فق الحق ولو كنت وحدك

''جماعت وہ ہے جو حق کے تابع ہو چاہے تم اکیلے کیوں نہ رہ گئے ہو''۔

اب جس مجمع کو ایک بڑے بحران سے بلکہ ایک عدیم النظیر بحران سے نکال لانے کا چیلنج ہمیں درپیش ہے ___ جیسا کہ فصل اول میں بھی ہم اس جانب اشارہ کر آئے ___ وہ طبقہ ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کو اپنے لئے حجت مانتا ہے۔ اس کو طبقہ ہائے اہلسنت کہا جاتا ہے اور اس میں مذاہبِ اربعہ مثل احناف، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ، علاوہ ازیں اہل الحدیث اور اہل الظاہر وغیرہ سبھی آ جاتے ہیں۔ کیا ہمارے پاس کوئی ایسے ضوابط ہیں جو ان سب طائفوں اور ان طائفوں کے ذیل میں آنے والی سب جماعتوں اور دھڑوں اور گروہوں کو ___ ان کا تنوع برقرار رکھتے ہوئے ___ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کی جانب رجوع کرنے اور دین کو لے کر ایک ساتھ چلنے کے اس عمل میں مدد دے سکیں؟ ان کیلئے اجتماع کی ایک معقول بنیاد فراہم کرسکیں اور ان کے اتفاق اور اختلاف ہر دو کو ایک ضبط میں لاسکیں اور یوں اس عمل کے نتیجہ میں وحدت کے تصور کو ایک عملی جامہ پہنا سکیں؟ 'اصول اہلسنت' میں درحقیقت ہمارے ان سب سوالات کا جواب موجود ہے۔

□□□□□□

'اجتماع' کیلئے 'اتفاق' کی شرط لگانا نہ تو نقل کا تقاضا ہے اور نہ عقل کا۔ یہ لوگوں سے ایک غیر طبعی مطالبہ ہے۔ شریعت نے یہ بات کہیں فرض نہیں کی۔ البتہ شریعت میں اور اصول اہلسنت کے اندر اس کی کچھ حدود اور قیود ہیں۔ اختلاف ایک انسانی واقعہ ہے۔ درست ترین بات یہی ہوسکتی تھی کہ اس کی ممانعت نہ ہو بلکہ اس کی حدود متعین کر دی جائیں۔

پس نہ تو ہر امر میں اتفاق لازم ہے اور نہ ہر معاملہ میں اختلاف کی اجازت۔ البتہ اجتماع کا حکم ہے اور افتراق کی ممانعت۔ 'اجتماع' دراصل 'اتفاق' سے ایک وسیع تر چیز ہے۔ اسی طرح 'افتراق' محض 'اختلاف' سے ایک مختلف واقعہ ہے۔ نہ تو ہر معاملے میں اتفاق کا ہونا اجتماع کیلئے شرط ہے اور نہ اختلاف کا بعض معاملات میں ہو جانا افتراق کا موجب۔

البتہ وہ معاملات بے حد واضح ہو جانے چاہئیں جن پر اتفاق ہو جانا فرض ہے اور اجتماع کیلئے ایک پیشگی شرط۔ اسی طرح ان معاملات کا بھی واضح ہو جانا ضروری ہے جن میں اختلاف قطعی طور پر حرام اور ناقابل قبول ہے اور اجتماع کے راستے کی ایک قطعی رکاوٹ۔ ان دونوں کے مابین پھر وہ معاملات خود بخود واضح ہو جاتے ہیں جن میں نہ تو اتفاق شرط ہے اور نہ اختلاف رکاوٹ۔

جب ایسا ہے......یعنی نہ تو اختلاف کی کھلی چھٹی ہے اور نہ اتفاق کی کلی شرط ......تو پھر آپ کے پاس کوئی ایسا متوازن ضابطہ ہونا چاہیے جس میں ان دونوں کی حدود طے کر دی گئی ہوں اور جس میں ہر دور اور ہر خطے کے لوگوں کیلئے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے کی گنجائش نہ رہنے دی گئی ہو۔

ایک بے قابو مجمع کو یکسوئی کی راہ پر ڈال دینا بے حد محنت طلب اور وقت طلب کام ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس میں خدا کی توفیق درکار ہے۔ اس پر وقت اور محنت صرف ہو، یہ ہرگز باعث تعجب نہ ہونا چاہیے اور ایک سمجھدار کو تو ہرگز اس سے جی نہ چرانا چاہیے۔ اس پر محنت نہ ہوگی تو اور کس بات پر محنت ہوگی۔ امت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کرنے سے بڑھ کر کیا نیکی ہو سکتی ہے؟ البتہ جو چیز دیکھنے کی ہے اور اس معاملہ میں بے انتہا اہم اور فیصلہ کن حیثیت رکھنے والی ہے وہ یہ کہ اجتماع کا وہ نسخہ جس پر ایک منتشر مجمع کو لایا جانے کیلئے ایک طویل محنت ہونا ہے کہاں تک اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ آپ کے وقت اور محنت کا عین صحیح مصرف ہے اور یہ کہ کہاں تک وہ اجتماع کا واقعتاً ایک درست طریقہ ہے اور کہاں تک

وہ اتفاق اور اختلاف کے درست اور متوازن ضوابط پر مبنی طرز عمل ہے۔

'اصولِ اہلسنت' دراصل ان سب باتوں کا ایک صحیح ترین جواب ہے۔ یہ نہیں تو پھر آپ کے پاس اجماع کی کوئی بنیاد نہیں سوائے اس کے کہ ہر آدمی 'اجماع' کیلئے ایک ہی شرط رکھے اور وہ یہ کہ سب دوسرے لوگ بس ایک اسی کے یا اسی کی جماعت یا اسی کے بڑوں کے فہم دین پر آجائیں اور یہ کہ قرآن اور حدیث سے جس طرح خود اس کو یا اس کے بڑوں کو دین کے سب مسائل سمجھ آئے ہیں عین اسی طرح سب دوسروں کو سمجھ آنے لگیں!

طرفہ یہ کہ کچھ لوگ دوسروں پر اپنی یا اپنے مذہب کی تقلید کی شرط بھی نہیں لگاتے مگر یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو دین کے سب اصولی اور فروعی مسائل قرآن وحدیث سے ویسے ہی سمجھ آئیں جیسے خود ان کو یا ان کی جماعت کو اور ان کے بڑوں کو سمجھ آئے ہیں بصورت دیگر لوگ انما هم فی شقاق [1] کی حالت سے باہر نہیں اور وہ خود إنک علی الحق المبین [2] کا مصداق۔ کیونکہ اپنے تئیں یہ کتاب وسنت کے متبع ہیں اور دوسرے لوگ اپنی باطل خواہشات کے پیروکار! اب جس بات کا یہ اپنے تئیں حق رکھتے ہیں عین اسی بات کا اتنا ہی حق اگر دوسروں کو بھی حاصل ہو تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو حق کا مصدر ماننے والوں کے مابین اجماع کی کیا صورت باقی رہ جاتی ہے؟

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب وسنت کے فہم واستنباط کی بابت خود اپنی یا اپنے بڑوں کی تقلید کی شرط لگاتے ہیں وہ درحقیقت امت کو اپنی شروط پر مجتمع کرنا چاہتے ہیں۔ ہر شخص اگر دوسروں پر یہ شرط لگانا شروع کردے تو امت کا اجماع کہاں گیا؟

لامحالہ آپ کو کوئی ایسا طریقہ کار درکار ہے جو لوگوں کو کسی بات کا حق دے تو سب کو ایک سا حق دے اور اگر کسی بات کی پابندی لگائے ___ ظاہر ہے کہ پابندیوں سے بالکل آزاد اجماع کا کوئی تصور نہیں ___ تو سب پر ایک سی پابندی لگائے۔ اس کے

---

(۱) البقرۃ:۱۳۷ ''وہ تو صاف مخالفت (ہٹ دھرمی) پر ہیں''
(۲) النمل:۷۹: ''بے شک تو ہی بین حق پر ہے''

اس 'حق دینے' اور 'پابند کرنے' میں کچھ ایسا توازن اور حکمت ہو کہ لوگ مجتمع بھی رہیں اور مصادرِ دین سے فہم واستنباط کرنے اور اپنے فرائضِ دین کا تعین کرنے میں ایک خاص حد تک آزاد بھی رہیں۔ یگانگت بھی ہو اور سوچ اور فہم کا ایک تنوع بھی برقرار رہے۔ نہ یہ ہو کہ اختلاف کی کھلی چھٹی ہو اور دین کی کسی بھی بنیاد کو کوئی بھی شخص کسی بھی وقت چیلنج کر لینے کا مجاز ہو اور نہ یہ کہ فروعِ دین کے ہر ہر مسئلہ میں لاکھوں کروڑوں لوگ نسل در نسل اور صدیوں تک ایک ہی طرح سوچنے اور ایک ہی سا عمل کرنے کے پابند ہوں چاہے علم اور دلیل کی روشنی میں کسی کو اس سے کتنا ہی اختلاف ہو۔

□□□□□□

یہاں ایک دوسری انتہا کا ذکر کر دیا جانا بھی بے حد ضروری ہے۔

امت کے اس دورِ انتشار میں اس اندازِ فکر نے بھی بے انتہا ترقی کی ہے۔ اس کو زیادہ تر دانشور طبقہ کے ہاں پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور آج یہ اپنے معاشرے میں ایک ترقی یافتہ اور 'علمی' طرزِ فکر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ میڈیا اس چیز کی تبلیغ کا موثر ترین فورم ہے۔ مذہبی جماعتوں کا سیاسی نشاط بھی اس سوچ کے مقبولیت پانے میں مساعد ہوا ہے۔

اس طرزِ تفکیر کا لب لباب یہ ہے کہ ہر آدمی اور ہر طبقے کو دین کی تفسیر کے معاملے میں اپنی رائے رکھنے کی کھلی چھٹی ہو۔ اختلاف رائے کی قطعی آزادی ہو۔ 'اختلافِ رائے' کا یہ حق لوگوں کو ''اصولِ دین'' کے اندر بھی اتنا ہی ہو جتنا کہ 'فروعِ دین' کے اندر! بس کسی کو اس کے نظریہ یا عقیدہ کی بنا پر غلط نہ کہا جائے! 'مخالفت' کسی کی نہیں ہونی چاہیے! ہر معاملہ میں آدمی زیادہ سے زیادہ بس ایک 'علمی' اور 'تحقیقی' نوعیت کا اور ایک 'روادارانہ' سا اختلاف کرسکتا ہے اور اختلاف کے وہ سب آداب جو اہلسنت کے ہاں 'فروعِ دین' کے اندر ملحوظ رکھے جاتے ہیں وہ ان کے نزدیک ''اصولِ دین'' کے معاملہ میں بھی فرض ہیں! کسی کو باطل پر جاننا اور گمراہی کا پیروکار ماننا ان کے

نزدیک ایک پسماندہ اور غیر علمی رویہ ہے خواہ وہ دین کا کتنا ہی بنیادی مسئلہ کیوں نہ ہو! 'جذبات' میں آنا، کسی بھی معاملہ میں، ان اصحاب کے نزدیک حد درجہ معیوب ہے۔ کوئی رافضی ہے اور اپنے اماموں کی عصمت کا معتقد ہے۔ دوسری طرف صحابہ کیلئے ایک لفظ اچھا بولنے کا روادار تک نہیں (یہ ظاہر کا معاملہ ہے، سینے میں جو چھپائے بیٹھا ہے وہ تو صرف خدا کو معلوم ہے) اور بخاری و مسلم سے لے کر محدثین اہلسنت کی مروی کسی ایک بھی ایسی حدیث کو قابل اعتنا نہیں جانتا جس میں عائشہؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، انس بن مالکؓ اور ام سلمہؓ وغیرہ ایسے نام آتے ہوں، الا یہ کہ اس کی تائید اس کے نزدیک ائمہ معصومین سے ہوتی ہو...... تو بھی اس پر تشنیع جائز نہیں۔ آپ مصر ہی ہیں تو اس سے ایک 'دوستانہ' اور 'محققانہ' اختلاف کیجئے اور خود اپنی رائے اس سے مختلف رکھیے مگر 'الجھنے' کی ضرورت نہیں! ایسے اختلافات کے باوجود باہم مل کر اور ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اُمت کی وحدت اور یکجہتی کا پروگرام سرے چڑھایا جا سکتا ہے! کوئی شخص شرک کا داعی ہے۔ وحدۃ الوجود کا مبلغ ہے۔ کوئی شریعت کو طریقت سے الگ کر دینے پر اعتقاد رکھتا ہے۔ کوئی معتزلہ کا پیروکار، وحی کو اپنی عقل کی سان پر کستا ہے۔ کوئی دین کو سیاست سے جدا کرتا ہے اور خدا کو صرف 'مذہبی معاملات' میں معبود مانتا ہے...... ان سب رجحانات کے ساتھ آپ زیادہ سے زیادہ 'اختلاف' رائے رکھیے۔ اس کو 'نقطہ نظر' کا فرق سمجھیے البتہ ایسے کسی معاملہ میں جہنم اور ہلاکت کی وعید سے کسی کی سمع خراشی کرنا ایک غیر علمی طرز عمل سمجھا جانا چاہیے اور وحدتِ اُمت کے منافی!!!

یہ اس معاملہ کی ایک دوسری انتہا ہے۔ مختلف طبقے مختلف انداز سے اس اپروچ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ دانشور اس حد کو چھونے میں اپنا انداز رکھتے ہیں۔ سماجی کارکن اپنا اسلوب رکھتے ہیں۔ میڈیا اپنی وجوہات رکھتا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں میں مشغول بعض مذہبی جماعتوں کے ہاں اس کی کچھ اور بنیاد ہے۔ البتہ خلاصہ اس انداز فکر کا یہی بنتا ہے۔ اس کی

رو سے 'وحدت اُمت' کیلئے دائرہ اتنا ہی وسیع کرنے کی ضرورت ہے جتنا کہ کسی دور کے اندر اسلام کے نام لیوا طبقوں کے ہاں پائی جانے والی گمراہیاں، معاشرے میں برقرار رہنے اور ہرگز نہ چھیڑا جانے کا تقاضا کریں! انحرافات اور گمراہیوں کو باہر نکالنے کی کیا ضرورت ہے آپ وحدت اُمت کا دائرہ ہی اتنا کھلا کر لیجئے کہ ہر چیز اس میں آپ سے آپ آ جائے اور کسی کو کسی کے سر آنے کی احتیاج ہی باقی نہ رہے! یہاں سب خوش رہیں اور اپنی اپنی سنائیں، آخر اس میں کیا مانع ہے!!!

چنانچہ یہ منہج جو کہ ''اساسیاتِ دین'' تک میں ہونے والے اختلاف پر 'مٹی ڈالنے' اور اس کو نظر انداز کروانے کی تلقین پر مبنی ہے، معاشرے کے پڑھے لکھے طبقے کے ہاں اس وقت خوب پذیرائی پا رہا ہے۔

دین اور عقیدہ کی بنیادوں کے اندر ہونے والا اختلاف شدید مہلک ہے۔ اس کو کسی صورت مسلم معاشرے میں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم بھی یہ ہے کہ ایک گمراہی کو صاف گمراہی کہا جائے۔ معاشرے میں اس کی شدید حوصلہ شکنی اور مذمت ہو اور اس کے پرچار کے صاف صاف آڑے آیا جائے۔ گمراہی کا شکار ہو جانے والے کسی شخص کو گمراہ کہنے سے احتراز کرنا کسی وقت مصلحت کا تقاضا ہے تو ضرور اس سے احتراز کر لیا جائے البتہ یہ کہ گمراہی کو گمراہی ہی نہ کہا جائے، یہ نا قابل تصور ہے۔ انحراف کی بیخ کنی معاشرے میں کسی وقت موقوف نہیں ہونی چاہیے۔ مسلم معاشرے میں باطل کا چلن ہونے دینا بہر حال روا نہیں۔

دین کے بنیادی امور و معتقدات میں پیدا کئے جانے والے انحرافات کے ساتھ محض اس وجہ سے رواداری برتنا کہ لوگوں کی کچھ تعداد اب ان کی معتقد ہے، ہرگز کوئی علمی رویہ نہیں۔ باطل عقائد اور افکار کا یہ کالا دھن کثیر اور بے قابو ہو جانے کے باعث بہر حال سفید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کوئی 'انتظامی' معاملہ نہیں۔ مسئلہ خدا کے دین کا ہے۔ یہ ایک انتشار کو وجہ جواز دینا اور افتراق کو سند فراہم کرنا ہے۔ یہ شریعت کے ثابت

اور معلوم حقائق پر ثبات و اصرار کے فرض سے دستبردار ہونا ہے اور حق و باطل کے معاملہ میں مصالحت compromisation پر اتر آنا اور خدا کی نصرت کا استحقاق کھو دینا...... جس سے کہ قرآن میں اہل ایمان کو بار بار تنبیہیں ہوئی ہیں۔[1] اس کو علمی رویہ تسلیم کرنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھنے والوں کے حق میں قطعی طور پر ایک غیر علمی رویہ ہے۔

یہ رویہ...... یعنی "اصولِ دین" میں اختلاف کو برداشت کرنا۔ مثلاً ایک غیر نبی کی عصمت، یا صحابہ یا اہل بیت کی تحقیر کے معاملہ کو، یا شرک وزندقہ کے نظریاتی وعملی رجحانات کے معاملہ کو، یا وحی کو عقل اور فلسفہ کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کے معاملہ کو، یا عبادتِ قبور یا کسی بھی اور گمراہی کو آدمی ایک 'اندازِ بے پروائی' سے لے اور ان امور میں 'غیر جانبداری' کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس 'اپنے کام سے کام' رکھے...... ایسا منہج رکھنے کو ایک علمی اور معقول رویہ ماننا مستشرقین کے ہاں روا ہو تو بات سمجھ آتی ہے۔ ان کو صرف افکارِ مشرق کا مطالعہ کرنا تھا۔ کیا حق ہے اور کیا باطل، اور کس چیز پر آدمی کو وسعت صدر کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور کس چیز پر آدمی کی غیرت کو جوش میں آجانا چاہیے، مستشرقین کو اس سے واقعی کچھ سروکار نہ ہونا چاہیے۔ مگر یہی رویہ قرآن پڑھنے والے معاشرے کی فکری قیادت کے ہاں بھی قابل قبول ہو بلکہ قابل فخر ہو اور اسی کو ایک علمی انداز فکر بھی باور کیا جائے، تو یہ بات یقیناً مسترد ہونے کے لائق ہے۔

مگر واقعہ کیا ہے؟ ہماری یہ یونیورسٹیاں جو ہمارے مسلم دانشوروں کی مادر ہائے علمی رہی ہیں کس کے زیر سرپرستی اور کس کے زیر انتظام پروان چڑھیں؟ کس کے

---

(۱) واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما أنزل اللہ الیک (المائدۃ:۴۹)
"ان سے ہوشیار رہیے کہ اللہ نے آپ پر جو اتارا اس کے کسی ایک حصہ سے بھی یہ آپ کو منحرف نہ کرنے پائیں"۔

ولئن اتبعت اھواء ھم بعد الذی جائک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا نصیر (البقرۃ:۱۲۰)
"اور اگر علم آنے کے بعد تو ان کی خواہشوں پر چلے تو اللہ سے تیرا حمایتی اور بچانے والا کوئی نہیں ہے"۔

دیے ہوئے نقشے پر ان علمی اداروں کی اٹھان ہوئی ہے؟ 'مستشرقین' کے سوا اس کے جواب میں آپ کس کا نام لے سکتے ہیں؟ سب جانتے ہیں عالم اسلام پر قبضہ سے بہت پہلے استشراق کا شعبہ مغرب میں اپنے مطلوبہ حجم اور استعداد کو پہنچ چکا تھا۔ یورپ کی فوجوں کے حرکت میں آنے سے بہت پہلے یورپ کے مستشرقین اپنے حصے کا کام کر چکے تھے اور اب وہ لوگ عالم اسلام کو صرف 'فزکس کیمسٹری' نہیں بلکہ 'اسلامیات' تک پڑھانے پر دسترس رکھتے تھے! اب وہ 'اسلامیات' جو ہم نے مستشرقین سے پڑھی اور آگے مستشرقین کے ولایت پلٹ تلامذہ سے اور پھر ان کے پڑھائے ہوؤں سے نسل درنسل پڑھی۔ اسی نے بڑی حد تک ہمارے یہاں کے 'جدید' دینی طبقہ کی ذہنی تشکیل کی۔ ابتدائی طور پر یہاں کے کورس اور تعلیمی سلسلے وضع ہوئے، حتیٰ کہ دینِ اسلام کے 'مطالعہ' کا ایک پورا منہج دیا گیا، تو وہ انہی کے ہاتھوں، یعنی مستشرقین کے ہاتھوں۔ اسکے بعد پھر جتنے بھی تعلیمی ادارے اور منصوبے اپنے یہاں بنے ان کی تہہ میں بڑی حد تک وہی ذہنیت اور وہی ڈھب کام کرتا رہا اور آج تک کر رہا ہے، جس کی شروع میں ایک بار داغ بیل ڈال دی گئی تھی۔ پھر کیا تعجب کہ استشراق کے دیے ہوئے بعض فیشن شعوری طور پر نہ بھی سہی لاشعوری طور پر ہمارے جدید تعلیم یافتہ اور دانشور اسلام پسند طبقہ کے ذہنی پس منظر میں کام کریں!

آگہی کا 'مصدر' source of inspiration انسان کے ذہن کی تشکیل کرنے میں بہرحال ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے جان چھڑانا ہرگز اتنا آسان نہیں۔ دین کو محدثین اور فقہاء وائمۂ اہلسنت سے پڑھنا اور دین کو مستشرقین سے یا مستشرقین کے ترتیب دیے ہوئے سلسلہ ہائے تعلیم سے پڑھنا شدید حد تک متضاد نتائج کے پیدا کرنے کا باعث ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات؟ استثناءات کا پایا جانا ہر جگہ ممکن ہے مگر ایک سلسلۂ تعلیم اور ایک مصدرِ دانش source of inspiration کی مسلمہ حیثیت کچھ استثناءات کے باعث مشکوک نہیں ہو جاتی۔

آج کا یونیورسٹی سے لے کر کالج اور اسکول تک پایا جانے والا جو ایک ظاہرہ phenominon ہے وہ اپنی پشت پر کچھ متعین اسباب اور ایک معلوم پس منظر رکھتا ہے۔ اس سے صرفِ نظر آپ یوں بیٹھے بٹھائے کس طرح کر سکتے ہیں؟ کوئی اسلامیات 'لازمی' پڑھے یا 'اختیاری'...... 'مطالعۂ اسلام' کی یہاں جو ایک اپروچ ہے اور 'مذہب' کو پڑھنے کی یہاں جو ایک جہت اور ایک انداز ہے وہ بہر حال کچھ تاریخی اسباب کی مرہون منت ہے۔ نصابوں کے اندر کچھ تھوڑی بہت تبدیلیاں کر بھی لی جاتی رہی ہوں، مگر اپروچ اور جہت کو تبدیل کرنے پر یہاں کون کھپا ہے؟!

اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں 'اسلامیات' پڑھی اور پڑھائی جانا ایک بے حد مستحسن امر ہے مگر وہ ذہنیت جو دین کے حقائق کا علم لینے کے پیچھے یہاں اس نظام میں کام کر رہی ہے وہ بلا شبہ جاہلیت کی تشکیل کردہ ہے۔ اس کے بارے میں کم از کم بھی یہ کہا جائے گا کہ ایک دیندار شخص تک کے حق میں یہ شدید آلودہ intensive polluted ہے۔ بہت تھوڑی استثناءات کو چھوڑ دیجئے تو عملاً یہاں 'اسلامیات' کا ہر طالب علم 'مطالعہ اسلام' کے اسی نظام کا ہی بڑی حد تک ایک تسلسل ہے جس کی یہاں کوئی ڈیڑھ دو سو سال پہلے بڑی سوچ سمجھ کر داغ بیل ڈالی گئی تھی۔

پس یہ سوال کہ آپ نے اسلام کا فہم کہاں سے لیا ہے، ایک بہت بنیادی سوال ہے۔ اسلام کچھ معلومات کا نام نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جو سب سے پہلے دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور انسان کو خدا کے حق کیلئے پوری دنیا کے مدمقابل کھڑا ہو جانے پر تیار کر دیتی ہے اور جس کی زد پھر انسان کے ہر ہر رشتے اور ہر ہر تعلق پر پڑ سکتی ہے۔ دین کا ہر معاملہ ایک 'دوستانہ اور برادرانہ اختلاف رائے' کا متحمل نہیں۔ الا یہ کہ دین محض 'معلومات' کا نام ہو یا زیادہ سے زیادہ بس حسنِ اخلاق کا ایک بے ضرر درس۔ نہ کہ 'لا' سے شروع ہونے والی ایک واضح اور دوٹوک اور متعین حقیقت جس کیلئے انبیاء جہاد کرتے رہے اور قتال بھی اور ہجرت بھی۔ دوستی بھی اور دشمنی بھی اور جس کو ہر تغیر سے بچا رکھنے

کیلئے صحابہ وتابعین نے اہل بدعت وانحراف اور اہل زیغ وضلال کے ساتھ درشت ترین رویہ اپنا لینے سے گریز نہ کیا۔

□□□□□□

یہ تو جدید اسلام پسند طبقہ کا معاملہ تھا جس میں بلاشبہ اچھے اچھے نمونے بھی پائے گئے مگر ان اچھے نمونوں کو استثناء کا ہی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس طبقہ میں پایا جانے والا ذہن عمومی طور پر وہی ہے جس کی جانب اوپر ہم نے اشارہ کیا۔ یہاں دین کے اساسی مسائل اور عقیدہ کے بنیادی امور کی بابت بھی اسی 'وسعتِ نظر' اور اسی 'فراخدلی' کا ثبوت دیا جاتا ہے جس کی کہ اہلسنت کے ہاں صرف اجتہادی مسائل میں گنجائش ہو سکتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ دین کے اندر ہونے والے بنیادی انحرافات اور عقیدہ میں در آنے والی گمراہیوں کی بابت ایک اندازِ بے پروائی اختیار کرنا ان حضرات کے نزدیک مستحسن جانا جاتا ہے۔ حمیت کو کسی معاملہ میں دخل نہیں۔ اسی کو ان کے ہاں intellectual approach کہا جاتا ہے!

إلا من رحم ربک

دوسری طرف ہمارا روایتی دیندار طبقہ ہے جس کی بابت ہم پیچھے کچھ بات کر آئے ہیں۔

یہاں شدت ہے۔ تمسک ہے۔ حمیت ہے۔ مگر بسا اوقات یہ سب کچھ اپنے محل پر نہیں ہوتا بلکہ وہاں پایا جاتا ہے جہاں یہ قابل ستائش ہونے کے بجائے معیوب ہونے لگے۔ بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے فریق کے ہاں وسعتِ نظر اور اختلاف رائے کو قبول کرنے کا انداز پایا جاتا ہے مگر وہ بھی چونکہ اپنے محل پر نہیں لہٰذا قابل ستائش ہونے کی بجائے معیوب ہو جاتا ہے۔

ہر چیز اپنے محل پر نہ ہو تو خوش نما نہیں رہتی۔ ظلم کی تعریف بھی یہی کی گئی ہے کہ ایک چیز کو اس کی جگہ پر نہ رہنے دیا جائے۔

پس ہمیں کوئی ایسا پیمانہ درکار ہے جس میں ہر چیز کی جگہ متعین کردی گئی ہو اور جس کے باعث ایک اچھی چیز ہمیشہ خوشنما ہی لگے اور بدنمائی اس کے قریب نہ آنے پائے اور جس کی بدولت مسلم نوجوان کے فکر و کردار میں ایک حسن اور توازن آئے۔ شدت کے مقام پر واضح شدت ہو اور وہاں مصالحت compromisation خارج از امکان ہو۔ جبکہ نرمی کے مقام پر نرمی ہو اور وہاں مفاہمت و رواداری پائی جائے، یہاں تشدد کا گزر نہ ہو۔ کوئی چیز بڑھ کر دوسری کی جگہ نہ لے۔ جہاں سختی اور مواجہت confrontation ضروری ہو وہاں وسعت نظر کا سوال اٹھ کھڑا نہ ہو اور جہاں دوستانہ و برادرانہ اختلاف رائے رکھا جانا چاہیے وہاں 'رزم حق و باطل' نہ برپا ہونے لگے۔

ایسا پیمانہ ظاہر ہے کہ بنایا نہیں جائے گا بلکہ دیکھا یہ جائے گا کہ ہمارے دین نے ہمیں کسی ایسے پیمانے کی طرف رہنمائی کی ہے یا نہیں اور آیا ہمارے پاس پہلے سے کوئی ایسا دستور موجود ہے جس میں اس توازن کی صحیح ترین مساوات equation ہمیں بتا دی گئی ہو اور حتیٰ کہ اس کی عملی تطبیق کر کے ہم کو دکھا دی گئی ہو؟ اصول اہلسنت دراصل اسی سوال کا کافی و شافی جواب ہے۔ ہمیں اس سلسلہ میں ایک پیمانہ اور ایک کسوٹی بلاشبہ حاصل ہے۔ بنانے کی بات ہے تو پیمانے بنائے کہاں جاتے ہیں!؟ ہر پیمانہ اپنے بننے کیلئے ایک پیمانے کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ حق کا پیمانہ مطلق طور پر وحی ہے۔ اسی سے پھر آگے سب پیمانے چلتے ہیں۔ حتی کہ عقل کی حدود تک اسی سے ماپی جاتی ہیں۔ رہا اس وحی کا فہم تو اس کا پیمانہ 'سلف' ہیں۔ اس کا پیمانہ وہ انسانی واقعہ ہے جس کو صاحبِ وحی نے خود اپنے ہاتھوں سے گھڑا اور مِن مِن کر اور تراش تراش کر ربع صدی میں اس کو تیار کیا اور اس کے عین مطابقِ وحی ہونے کی خوب خوب تسلی کی اور بعد والوں کو کرائی۔ اور قیامت تک آنے والوں کو اسے "پیمانہ" تسلیم کرنے کی تاکید فرمائی۔ "ما أنا عليه وأصحابي"[1] اس کا مجموعی تسلسل پھر تابعین اور اتباع

(۱) ترمذی: حدیث نمبر ۲۵۶۵ "وہ چیز جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ"

تابعین رہے۔ ان تین نسلوں کو سلف کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد فتنوں اور انحرافات نے امت کے اندر گو بڑی بڑی سطح پر مقبولیت پائی اور حق کا معاشرے میں پھر اس طرح بول بالا نہ رہا جس طرح کہ قرون ثلاثہ میں۔ مگر بعد والوں کو ایک پیمانہ اور کسوٹی دے دینے کیلئے یہ بہت کافی تھا۔ اس کے بعد اس بڑی سطح پر نہ سہی مگر کسی نہ کسی سطح پر اور تاریخ کے بعض ادوار میں تو خاصی اچھی سطح پر یہ تسلسل ہمیشہ باقی رہا اور اُمت کے جسم پر حملہ آور امراض وانحرافات کے خلاف مسلسل برسرِ پیکار رہا...... اس تسلسل کا نام اہلسنت تھا۔ اس کو پسپائی بھی ہوئی۔ یہ ہم مانتے ہیں۔ خصوصاً آخری صدیوں میں۔ دلچسپ بات یہ کہ اس کی پسپائی اُمت کے زوال کا پیمانہ ٹھہرا۔ پس یہ ہر معاملے میں ایک پیمانہ رہا۔ اُمت کا عروج بھی اسی سے ماپا جاسکتا ہے اور زوال بھی۔

پس یہ درست ہے کہ اصول اہلسنت کو آج آپ کسی بڑی سطح پر قائم نہیں دیکھتے اور موجودہ صورتحال میں اس کو بڑی حد تک غائب پاتے ہیں مگر یہ اس صورتحال کے درست ہونے کی دلیل نہیں۔ یہ بات اصول اہلسنت سے بے نیاز رہ سکنے کا جواز نہیں۔ بلکہ یہ اس زوال کی تفسیر ہے جو ہمیں پچھلی کچھ صدیوں سے لاحق ہے اور جو کہ ایک بے قابو مجمع کی صورت میں اب ہمارے سامنے ہے اور ایک ایسے پیمانے کا شدت سے ضرورت مند جو اسے اس انتشار اور اس بحران سے نکال کر یکسوئی کی راہ پر گامزن کر سکے۔

ہم ایک خود کفیل اُمت ہیں۔ اس بنا پر یکسوئی ہمارا حق ہے۔ تجربے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے سے ہمیں بچا لیا گیا ہے الا یہ کہ ہم خود ہی اس پر اصرار کریں اور اس نعمت کا اندازہ کرنے سے انکاری ہوں جو خدا نے ہم پر کر رکھی ہے۔ ہمارے دین میں اور سلف کے راستے میں ہمارے لئے سب خیر رکھ دی گئی ہے۔ ایک پورے اطمینان اور تسلی کے ساتھ اس کو بنیاد بنا کر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ کن باتوں میں ہم کو یک آواز ہونا ہے اور کن امور میں اپنی آوازوں اور لہجوں کا

تنوع باقی رکھا جا سکتا ہے، ہمیں اس معاملے میں رہنمائی بالفعل حاصل ہے۔ اس لحاظ سے ہم دنیا کی ہر قوم سے بڑھ کر پیدآور productive قوم ہو سکتے ہیں۔ کسی قوم کو اپنے تمام تنوع کے ساتھ مجتمع رہنے کی بہترین بنیاد حاصل ہو اور مل کر آگے بڑھنے کیلئے اس کا راستہ سرے تک روشن ہو اور پھر یہ کہ اول سے آخر تک اس کا حق ہونا ثابت ہو اور وہ اس کی دنیا ہی نہیں آخرت کی بھی ضمانت ہو، اس سے بڑھ کر اس کو کیا چاہیے؟ ہم اس کی تمنا کریں؟ بطور امت ہمیں یہ چیز بالفعل دے دی گئی ہے!

عبداللہ بن مسعود کہا کرتے تھے:

اتبعوا ولا تبتدعوا فقد کفیتم

(سنن دارمی، حدیث نمبر ۲۱۰)

''اپنے سے پہلوں کی راہ پر چلو اور اپنی اپج مت لڑاؤ۔ کیونکہ تمہیں (اس ساری زحمت سے) کفایت کر دی گئی ہے''۔

ایسی یکسوئی کیا کسی قوم کو حاصل ہو سکتی ہے؟ اپنے یہاں اگر اس کا فقدان ہے تو ہمیں اپنے فہم کے ان مراجع پر جو دین اور عبادت کا مقصود پانے کے معاملے میں ہمیں آج تک متاثر کرتے رہے ہیں، ایک نظر ثانی کر لینی چاہیے۔

□□□□□□

پس اس سوال کا جواب دے لینا بہت ضروری ہے کہ آپ نے دین کا فہم لیا کہاں سے ہے؟ دین کو جاننے کیلئے آپ کا مصدرِ فہم source of inspiration یہاں کے درسی نصاب ہیں؟ تنظیمی لٹریچر ہے؟ 'اسٹال' پر فروخت ہونے والی کتب اور رسائل ہیں؟ جلسے اور پروگرام ہیں؟ تقریر اور تحریر کے مناظرے ہیں؟ 'ذاتی مطالعہ' ہے؟ تراجمِ کتب ہیں؟ ریڈیو اور ٹی وی کی 'مذہبی' نشریات ہیں؟ اخبارات کے 'روحانی' ایڈیشن ہیں؟......اور یا پھر اصولِ اہلسنت کے مستند مصادر؟

کسی 'لٹریچر' یا 'پروگرام' یا 'تقریر' وغیرہ کی افادیت کم کرانا یہاں ہمارا مقصود نہیں۔ یہ سب کچھ بجا مگر یہ کس حد تک آپ کو سلف کے منہج سے جوڑتا اور ''اصولِ اہلسنت'' سے وابستہ کرتا ہے اور کہاں تک آپ کو یہ خود 'اپنے' ساتھ یا 'اپنے سلسلے' کے ساتھ وابستہ کرتا ہے؟ یہ لٹریچر، یہ نصاب، یہ پروگرام اور یہ تقریریں وغیرہ کہاں تک یہ آپ سے 'اپنے' اوپر انحصار کرواتے ہیں اور کہاں تک یہ آپ کو سلف تک پہنچا کر آتے اور سلف کے دستر خوان کا خوشہ چین بناتے ہیں؟ کہاں تک یہ آپ کا سلف پر انحصار کرواتے ہیں؟ دیکھنے کی بات صرف یہ ہے وگرنہ تحریر اور تقریر کی سرگرمی کسی دور میں بھی بُری نہیں۔

آئندہ فصول میں ہم اس موضوع کے کچھ مزید پہلو زیر بحث لائیں گے اور پھر ذرا آگے چل کر فہمِ دین کے معاملہ میں اصولِ اہل سنت کا پابند رہنے کی شرعی بنیادوں کا ذکر کریں گے۔

□□□□□□

تقسیم عام کیلئے، یہ مضمون علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں، سستی چھپائی کے ساتھ، دستیاب ہے

مُسلّمات کی ضرورت

قوموں کی زندگی میں اور انسانی معاشروں کے اندر بعض معاملات کو نبیڑے اور ہمیشہ کیلئے طے کر دیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ یہ بات سماجی امور کے معاملہ میں بھی سچ ہے، طبعی علوم کے معاملہ میں بھی، فکری امور کے بارہ میں بھی، اور قومی وسیاسی بنیادوں کی بابت بھی۔

مسلّمات کا پایا جانا پس قوموں کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں اگر کہیں کوئی جھول پایا جانے کا امکان ہے تو وہ اس لئے کہ قوموں اور معاشروں میں جن باتوں پر اتفاق کر لیا جاتا ہے ان میں سے کسی ایک کی بنیاد بسا اوقات کسی ٹھوس علمی ثبوت کے بغیر رکھ لی گئی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض طبعی یا سماجی مسلّمات کبھی بیک وقت غلط بھی ثابت ہو جاتے ہیں اور قوم کی زندگی میں ایک بنی بنائی عمارت اس کے باعث دھڑام سے گر جاتی ہے اور تب وہ ایک بڑے بحران میں جا پڑتی ہے۔ مگر اس خطرے اور احتمال کے باوجود قوموں اور معاشروں کی زندگی میں مسلّمات کے پائے جانے کی ضرورت اصولاً ختم نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ اس کے بغیر کسی انسانی اکٹھ کا مل کر آگے بڑھنا اور اس راستے میں ان کے مابین نسلوں تک یکسوئی اور ہم آہنگی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں۔ ہاں کچھ ضروری ہے تو وہ یہ کہ مسلّمات پوری طرح ٹھوک بجا کر اور ٹھوس علمی بنیادوں پر قائم کئے گئے ہوں۔ جس کی کہ ہمارے دین میں حیرت انگیز حد تک تاکید ہے خواہ وہ شرعی مسئلہ ہو یا حتی کہ طبعی اور مادی علوم کا:

ولا تقف ما لیس لک به علم. ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنه مسئولا (الاسراء:۴۲)

''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دِل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے''۔

البتہ جہاں تک اس امت کا تعلق ہے تو اس کو جو مسلمات حاصل ہیں سب اقوام میں وہ اس لحاظ سے منفرد ترین ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں ''مسلمات'' ہیں، یعنی کسی وقت ان میں اضطراب آ جانا ممکن نہیں۔ یعنی یہ ہماری اجتماعی زندگی میں مضبوط ترین عمارت اٹھا دینے کی ضمانت ہو سکتے ہیں۔

عام خیال اس وقت یہاں یہ ہے کہ امت مسلمہ کو یہ مسلمات صرف ''مصادرِ دین'' ہی کی بابت حاصل ہیں، یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہﷺ، البتہ ان مصادر کے 'فہم وتطبیق' کی بابت لوگ جو بھی جہت اپنائیں، حتی کہ اس پر کسی وقت باہم دست وگریباں پائے جائیں، تو اس معاملہ میں کوئی باقاعدہ معیار اور کوئی معتمد علیہ صورت اس امت کو میسر نہیں! یہی وجہ ہے ہمارے برصغیر کی فکری وتحریکی دنیا اس وقت ایک آشوب ناک صورت میں گرفتار رہے۔ اس ثانی الذکر غلط فہمی، یعنی نصوص کے فہم کے معاملہ میں کوئی مراجع ہمیں بطورِ پیمانہ میسر نہیں، اس ثانی الذکر غلط فہمی کو دور کر دینا ہی اس کتابچہ میں ہمارا موضوع ہے۔

مراجعِ فہم کیا واقعتاً ہماری ضرورت ہے؟ اس پر کچھ بات ہو جانا شاید مناسب رہے......

بلاشبہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہﷺ ہمارے لئے ہدایت کا منبع ہے، اور اس کے مُسلَّمہ ہونے میں، سوائے کچھ ہلاکت میں پڑنے والے فرقوں کے، کسی کو کوئی کلام نہیں۔ یہاں تک کہ اس پر مزید وقت صرف کرنا بھی ہمارے خیال میں ضروری نہیں۔ البتہ ہماری ضرورت صرف یہیں تک نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا اس بات کا امکان

ہے کہ ایک آدمی کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ سے استدلال کرنے میں دانستہ یا نادانستہ ایک غلط طرزِ عمل اپنا لے اور کہیں سے کہیں جا پہنچے یا پھر اس بات کی کوئی ضمانت اتاردی گئی ہے کہ قرآن وحدیث ہر آدمی کو ہر حال میں درست ہی سمجھ آئے گا اور کوئی شخص بھی دین کو اس کے اس مصدر سے سمجھنے میں ہرگز کوئی ٹھوکر نہیں کھائے گا؟

کیا اِس اُمت کا وقت اور وسائل اس بات کے متحمل ہیں کہ ہر شخص یا مجموعۂ اشخاص یا مکتبِ فکر یہاں اٹھے تو دین کی ایک از سرِنو تعبیر کرے اور تب کوئی دوسرے شخص یا مجموعۂ اشخاص یا مکتبِ فکر یا حتی کہ پوری اُمت کیلئے اِس کی تصحیح یا اِس کا رد کرنے کی مصروفیت نکل آئے! ہر وہ شخص جو کسی دوسرے کی پکڑ کرنے کیلئے آگے بڑھے ایک نیا شخص پھر اس کی پکڑ کرنے کو اُٹھ کھڑا ہو اور 'گیند چھیننے' کا یہ کھیل فہم دین کے نام پر کھیلا جائے، جیسا کہ صدی بھر سے ہمارے برصغیر میں ہو بھی رہا ہے!؟

یا پھر ''مصادرِ شریعت'' ہی کی طرح ''مصادرِ فہم'' کے معاملہ میں بھی اس امت کو کفایت کردی گئی ہے اور یہ مؤخر الذکر مسئلہ بھی اس کی تاریخ میں مسلمات کے زمرے میں آتا ہے؟

حق یہ ہے کہ اصول اہلسنت کی رو سے ہر دو امر میں ہمیں کفایت کردی گئی ہے اور سرگردانی کی اس امت کے پاس ہرگز کوئی گنجائش نہیں۔

آپ بہت ذہین اور وقت کے نابغہ ہیں اور بے شک محنت اور مطالعہ بھی بہت کرتے ہیں۔ کیا یہ اس بات کیلئے بہت کافی ہے کہ آپ دین کی ایک تفسیرِ نو کے مشن پر نکل کھڑے ہوں اور اپنے ساتھ اُمت کے ایک خاصے بڑے طبقے کو بھی مصروف کرلیں؟ حتیٰ کہ ہر ذہین آدمی امت کے اندر یہی کام کرے اور یوں روز اس امت کے چلنے کو ایک نیا راستہ سامنے لایا جائے، یعنی کوئی حتمی چیز اس باب میں یہاں کبھی پائی ہی نہ جائے!!!!!؟

امام مالکؒ کے پاس ایک شخص آیا اور دِین کے کچھ بنیادی اُمور میں آپ کو بحث وگفتگو کی دعوت دی (آپ اندازہ کر سکتے ہیں امام مالکؒ کے ساتھ ماتھا لگانے والا شخص کوئی کم علم یا معمولی قابلیت کا آدمی نہ ہوگا) امام مالکؒ کو اس کا کہنا تھا: ''آؤ بات کر کے دیکھتے ہیں۔ اس شرط پر کہ میں جیتوں تو تم میرے ہم خیال ہو جاؤ گے اور تم جیتو تو میں تمہارا ہم خیال ہو جاؤں''۔

''اور اگر کوئی تیسرا شخص ہم دونوں کو خاموش کرا دے؟'' امام مالکؒ نے اس تجویز پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔

''تو ہم اس کی بات تسلیم کر لیں گے''۔ اُس شخص کا جواب تھا۔

بظاہر دیکھئے تو اس شخص کی بات سے بڑی ہی انصاف پسندی اور حق پرستی جھلکتی ہے! ہوسکتا ہے وہ شخص اخلاص ہی سے یہ بات کہہ رہا ہو۔ بظاہر خاصی اصولی پیش کش ہے! مگر امام مالکؒ اس کا جو جواب دیتے ہیں حقیقت یہ ہے وہ آپ ایسے ائمۂ سلف کا ہی حصہ ہے، فرمایا:

''تو کیا جب بھی کوئی نیا شخص میدان میں آئے اور پہلے والے سے بڑھ کر دلیل دے لینے کی مہارت دِکھائے تو ہم اپنا دین اور راستہ تبدیل کر لیا کریں؟ سنو، میں اپنا دین یقینی طور پر معلوم کر چکا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ تمہیں اپنا دِین تا حال معلوم نہیں تو جہاں چاہو تلاش کرتے پھرو''۔

یہ ہیں ہمارے ائمہ!

أولئک آبائی فجئنی بمثلھم

امام مالکؒ کے اس جواب میں اہلسنت کا تقریباً سارے کا سارا منہج تلقِّی پوشیدہ ہے۔ 'دین' محض ذہانت کا کارنامہ نہیں۔ 'دین' کوئی 'دلائل' دے لینے کا نام بھی نہیں۔ یہ کوئی 'خورد بینی' عمل بھی نہیں۔ ایسا ہوتا تو خدا کی یہ سیدھی سادی مخلوق تو ماری ہی جاتی۔ ایک کثیر خلقت جو بیچاری تلاشِ

روزگار میں صبح سے شام کر دینے پر مجبور ہے تب اس کی ہلاکت یقینی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دین 'فلسفہ' نہیں گو فکرِ اعتزال کی یہی کوشش رہی ہے کہ دِین کو ذہانت اور فطانت کا کمال ٹھہرا دیا جائے جس کی رو سے ____ فلسفی افکار ہی کی طرح ____ ہر نیا ذہین پرانوں کی بہت سی باتوں کو 'دلیل' کے زور پر غلط ثابت کر دے اور پھر کوئی اور ذہین اُٹھے تو اس کی دلیل کو بے دلیل کر دے...... یوں کسی معاملے کا حتمی فیصلہ قیامت تک نہ ہو!

یقیناً ان لوگوں کا فیصلہ قیامت ہی کو ہونے والا ہے!

حق یہ ہے کہ 'دین' کا تعین ایک بہت ہی سادہ عمل ہے۔'دین' ایک متعین حقیقت ہے جس کا کہ نزول بھی عمل میں آ چکا ہے اور جو زمین پر سمجھی بھی جا چکی ہے۔ بیان بھی ہو چکی ہے۔ روئے عمل بھی آ چکی ہے۔ نقل بھی ہو گئی ہے اور روایت بھی۔ ہزاروں لاکھوں کی خلقت ____ جس میں ہر اہلیت کے لوگ شامل تھے ____ برس ہا برس تک اس کا فکری، نظری، عملی، روحانی اور ایمانی مشاہدہ بھی کرتی رہی اور زندگی کے اندر اس کا عملی اور واقعاتی مظاہرہ بھی۔ پھر ان کے اس فکری مشاہدہ اور عملی مظاہرہ کے عین حق ہونے کی شہادت اس حقیقت کے نازل کرنے والے نے خود بھی دے دی ہے (والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه)[۱] اور جس پر یہ حقیقت نازل ہوئی اس نے بھی اس کی توثیق کر دی (ما أنا عليه وأصحابي)[۲]۔ پس اب اس حقیقت کی تلاش، تفکیر کے صغریٰ و کبریٰ میں نہیں بلکہ اس انسانی مجموعےؓ کے علم و عمل کے ذخیروں میں کی جائے گی اور اسی کے زیر تعلیم اور زیر تربیت رہنے

(۱) ''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا......'' (التوبۃ:۱۰۰)

(۲) ''وہ چیز جس پر میں (رسول اللہ ﷺ) ہوں اور میرے اصحابؓ ہیں''

(الترمذی: ۲۷۱۱)

والے 'تابعین' کے ہاں ڈھونڈی جائے گی، جن کی شاگردی کی جانب امام مالکؒ کا اشارہ ہے کہ "میں اپنا دین یقینی طور پر معلوم کر چکا ہوں کہ وہ کیا ہے، تمہیں اپنا دین تا حال معلوم نہیں تو جہاں چاہو تلاش کرتے پھرو"۔

دِین کا فہم کسی ادھیڑ بن کا نام نہیں۔ مسلمات کا پایا جانا، کہ جس کے بعد ایک قوم صرف آگے سے آگے ہی بڑھے اور اس کی زندگی میں ہر قدم بار بار از سر نو اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے، ایک شرعی ضرورت بھی ہے اور ایک انسانی واقعہ بھی۔ قوموں کی زندگی میں اور نسلوں کا تسلسل برقرار رہنے کیلئے اس سے ہرگز کوئی مفر نہیں۔ پھر امت (۱) ہونے کیلئے تو آپ کے ہاں مسلمات کا پایا جانا آپ کی سب سے بڑی ضرورت ہے......

ایک ایسی زمین جس پر آپ پورے اعتماد کے ساتھ اور قدم جما کر نہ چل سکیں ایک بڑے قافلہ کی گزرگاہ بننے کیلئے بے کار ہے۔

اس اُمت کو ایک 'بڑا قافلہ' بنا دینے کا انتظام ہمارے دِین میں پہلے دِن سے کر دیا گیا ہے۔ یہ دین محض افراد کے 'تحقیقات' کا موضوع بننے اور ہر ہر فرد کو اس کی اپنی خوردبین سے نظر آنے کیلئے نہیں اترا۔ یہ لاکھوں کروڑوں افراد کو بیک وقت اور نسل در نسل چلانے اور ایک بہترین جہت دینے اور دیئے رکھنے کیلئے آیا ہے۔ ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں اس سے جہت پاتے ہیں۔ اس دِین پر سات براعظم اکٹھے ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے فہم کی بابت عین اس بنیاد پر آ جایا جائے جس سے اس اُمت کے سلف ہم کو روشناس کرا گئے ہیں۔

---

(۱) اس بات کا ادراک لگتا ہے ان جدت پسندوں کو بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ "امت" کو ہی اب ایک فرضی اور وہمی چیز قرار دینے لگے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ 'امت' نام کی کوئی چیز اس دین کے اندر نہیں پائی جاتی! سنت وائمۂ سنت کی ہی جب کوئی حیثیت نہ رہی تو پھر آپ کی جو مرضی ہے وہ کہہ دیجئے اور جو مرضی وہ کر لیجئے! سنت سے ہٹنا خود بخود آدمی کو نشان عبرت بنا دیتا ہے۔ ان کی 'اگلی نسل' اب یہاں تک پہنچ کھڑی ہوئی ہے کہ مسلمان عورت ہندو مرد سے شادی کر لے تو بس وہ سماجی طور پر 'نا مناسب' ہو سکتا ہے البتہ شرعی طور پر ممنوع نہیں، کیونکہ اس بات کی کوئی دلیل ان کو 'اپنے' مصادرِ دین سے نہیں مل پائی کہ ہندو 'غیر قوم' ہونے کے علاوہ 'مشرک' بھی ہوا کرتے ہیں!

منہجِ سلف اور اصولِ اہلسنت ___ اس دِین کے فہم کی بابت ___ کچھ ایسے ہی مسلمات کا نام ہے۔

□□□□□□

پس مسلمات کا پایا جانا تو کسی گروہ کے 'اُمت' بننے اور بنے رہنے کیلئے ایک ناگزیر اور ایک طے شدہ امر ہے خواہ وہ دُنیا کی کوئی بھی قوم ہو۔ البتہ جہاں تک اس اُمت کا معاملہ ہے تو اس کیلئے 'کوئی سے بھی' مسلمات کام نہیں دیں گے۔ لہٰذا ہم جن مسلمات کی بات کرتے ہیں یہ وہی مسلمات ہیں جو اس وقت سے ہیں جب سے یہ اُمت وجود میں آئی اور جس کو کہ دورِ سلف کہا جاتا ہے۔ رہے وہ مسلمات جو آج ازسرنو قائم کئے یا متعارف کرائے جائیں گے اور لوگوں کو ان پر لایا جانے کیلئے ورق سیاہ کئے جائیں گے (کئی ایک مکتبِ فکر اس بات کیلئے سرگرم رہے ہیں اور کئی آج بھی ہیں) تو یہ نئے مسلمات نئے انداز کے مریل قافلے تشکیل دیں تو دیں مگر یہ اس اصل قافلہ کی تشکیل کرنے میں کام نہ دیں گے جو دراصل قرونِ اولیٰ کی یادگار ہے۔ جبکہ ہمیں کسی بات کی طلب اور غرض ہے تو وہ اسی سے ہے۔ یعنی اسی انداز کے کارواں کا 'پھر سے جادہ پیما ہونا' جو سلفِ اُمت کے نام سے ہمارے دلوں میں بستا ہے اور جس کا وزن تاریخ آج بھی محسوس کرتی ہے۔ رہے محدثاتِ اُمور تو انہوں نے ہمیں اِس دُنیا میں فائدہ دِیا ہے اور نہ آخرت میں دینے والے ہیں۔

مگر صورتحال عملاً آج کیا ہے؟ خاص طور پر ہمارے پڑھے لکھے حضرات دِین کے معاملے میں کس بات سے متاثر ہوتے ہیں؟ جس قدر کوئی نیا خیال ظاہر کیا گیا ہو وہ ان کو اتنا ہی مسحور کرتا ہے۔ پرانی روش سے جتنا ہٹ کر بات کی جائے وہ اُن کو اتنی ہی زیادہ 'مبنی بر تحقیق' معلوم ہوتی ہے۔ تحقیق دراصل ایک 'نئی اپج' کا نام بن گیا ہے۔ ذرا ایک نگاہ دوڑا لیجئے: برصغیر میں پچھلے سو ڈیڑھ سو سال کے دوران یہاں کے جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں دِین کی جو بھی تعبیریں اور روشیں عام ہوئیں ان

میں کوئی قدر مشترک ہے تو وہ بڑی حد تک یہی بات نظر آتی ہے۔

یہاں تک کہ اب کوئی ٹھوس بنیاد، فہم دِین کے معاملہ میں، بیشتر پڑھے لکھوں کے ہاں سرے سے ناپید ہو چلی ہے۔ایک 'بحث' ہے جو کسی بھی موضوع پر ہر وقت شروع کی جاسکتی ہے!

اس باب میں ہمیں جن مسلمات کی ضرورت ہے اور جن کو ہم نے ''اصولِ اہل سنت'' کا نام دیا ہے، آئندہ فصول میں ہم اس جانب کچھ اشارات کریں گے۔

☆☆☆☆☆

'صراطِ مستقیم' کا سوال کر لینے کے بعد
'صراط الذین أنعمت علیھم'
کی صراحت کی کیا ضرورت تھی؟

اب یہاں ہم ایک اہم موضوع متعارف کرائیں گے، گو یہ ادارہ ایقاظ کا ایک مستقل موضوع رہے گا بلکہ خدا نے چاہا تو اس کی پہچان بھی۔ یہ ہے 'دین کے فہم کے معاملہ میں ''اصولِ اہلسنت'' پر اعتماد'۔ یہ موضوع آگے چل کر ہمیں نہ صرف یہ کہ اہلسنت کا ایک تاریخی اور واقعاتی تسلسل بن جانے میں مدد دے گا بلکہ یہ ہمیں وحدتِ اُمت کا ایک درست اور متوازن تصور بھی دے گا اور عملاً اس راہ پر بھی ڈال دے گا۔

وحی کی طرف رجوع کس طرح؟ دین کی تفسیر اور تعبیر کے معاملہ میں بے شمار انداز اور طریقے اپنائے گئے ہیں۔ ان میں غلط اور درست کے تعین کا کیا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہے؟ پیش ازیں ہم اس سوال پر غور کر آئے ہیں کہ ہر آنے والے شخص کو دین کی تعبیر اور تفسیر کیا 'خود' کرنی ہے اور اس عمل کا 'ازسرنو' آغاز کرنا ہے؟ یا پہلے سے موجود کسی 'تسلسل' کا حصہ بننا ہے، جس کا مطلب ہے کہ امتِ محمدؐ میں اس کو پہلے سے کی گئی دین کی کسی تعبیر اور تفسیر کو ہی اپنانا ہے؟ اور پھر اس کیلئے کسوٹی کیا ہے؟ ''دین کے حقائق'' اور ''دین کے فرائض'' کے فہم میں اگر لوگوں کا کچھ فرق ہو گیا ہو، اور کسی حد تک تو یہ ایک انسانی واقعہ ہے، تو لوگوں کے اس اختلاف یا تنوع کے ساتھ کیونکر پیش آیا جائے؟ کیا

'ذرہ بھر' اختلاف کی گنجائش نہ دی جائے؟ یا اختلاف کے دروازے 'چوپٹ' کھول دیے جائیں؟ توازن کی کیا صورت ہو؟

اس معاملے میں کسی 'کسوٹی' کی ضرورت ہے تو وہ کیا ہر آدمی خود تجویز کرے گا؟ 'کسوٹی' اگر ہر آدمی خود تجویز کرے گا تو کیا سب سے پہلے ''کسوٹی'' کے تعین میں ہی اختلاف نہ ہو جائے گا؟ پھر وہ ''کسوٹی'' کیا ہوئی؟ کیا کہیں آ ملنے کی کوئی صورت ہے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ سے لئے جانے والے ''فہم واستنباط'' کی صحت جانچنے کیلئے لوگوں کے مابین آخر کوئی تو حوالہ refering point ہو!

اس معضلہ dilemma کو مناسب انداز میں حل کئے بغیر لوگوں کو اکٹھا کرنے کیلئے چل پڑنا ایک بڑے انتشار کو برقرار رکھنا اور حل کئے بغیر چھوڑ دینا ہے۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ سے درست رہنمائی لینے کا عمل اُمت میں ایک تاریخی واقعہ رہا ہے جس کا اب آپ کو خود اپنے دور میں تسلسل بننا ہے۔ اس میں اگر کچھ تنوع پایا گیا تو اس کی بھی کچھ حدود ہیں۔ اسی طرح آپ جانتے ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کی غلط تاویل اور باطل تشریح بھی اُمت کی تاریخ میں ایک واقعہ رہا ہے جس سے آپ کو دامن بچا کر رہنا ہے اور اس کا تاریخی تسلسل بننے سے خدا کی پناہ مانگنی ہے۔ وحی سے رہنمائی لینا چنانچہ ایک ''مسلسل عمل'' رہا ہے۔ یہ کام اُمت کی تاریخ میں آپ 'پہلی بار' نہیں کریں گے۔ باطل میں آپ کچھ یکسر نیا متعارف کرائیں تو اس کا ضرور امکان ہے کیونکہ باطل کسی خاص متعین صورت میں محصور نہیں۔ البتہ حق کے معاملہ میں وہ جو آپ سے پہلے ہیں آپ کو انہی کے پیچھے کھڑا ہونا اور انہی کے پیچھے چلنا ہے۔ **والذین اتبعوھم باحسان** (۱)۔ ایک پہلے سے چلے ہوئے راستے پر ہی آپ کو چلنا ہے۔ اس

(۱) التوبہ: ۱۰۰ ''اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں'' (ترجمہ: مولانا محمد جونا گڑھی)
''اتبعوھم''...... یہاں ضمیر ملاحظہ ہو۔ یہاں یہ ضمیر خدا اور رسولؐ کی طرف نہیں جاتی بلکہ سابقین اولین کی طرف یعنی ان لوگوں کی طرف جاتی ہے جو 'نئے آنے والوں' سے پہلے وحی کے متبع اور دین کے پیروکار تھے۔

راستے میں اگر کچھ تنوع ہے تو یہ انسانی فطرت ہے اور اس کی گنجائش ہونا خدا کی مہربانی ......مگر ایک مجموعی معنیٰ میں آپ اسی راستے پر رہنے کے مکلّف ہیں اور دوسری طرف اہل زیغ وانحراف کی راہ سے دور رہنے کے پابند۔حتی کہ ’’اہل زیغ‘‘ کا تعین بھی اہل اتباع کے تعین کے بعد اور اسی کے حوالہ reference سے ہوگا۔

واتبع سبیل من أناب الي [1]

صراط الذین أنعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین [2]

درست ہے کہ اُمت پر اس بار جو زوال آیا اور جس کی کہ پہلے کبھی کوئی مثال نہیں ملتی، امت کی صفوں میں ایک بڑے خلا کا باعث بنا۔اس کے باعث ’’اہلِ اتباع‘‘ کا وجود شدید حد تک متاثر ہوا اور اس انحطاط کے ان پر طرح طرح کے اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں تک کہ اب وہ نشاناتِ راہ جس پر یہ مجتمع قافلہ صدیوں تک کامیابی کے ساتھ چلتا اور علم وشعور، فکر وبصیرت اور تہذیب ومعاشرت کے سب میدانوں میں دنیا کو متاثر کرتا رہا......اس کے یہ نشاناتِ راہ اب ایک بڑی حد تک اور ایک بڑی سطح پر ازسرنو متعارف کرائے جانے کی ضرورت مند ہیں اور اس کے وابستگان کو اس راہ پر چلانا اب ایک محنت طلب کام ہے۔ یوں بھی زوال سے نکل کر عروج کی جانب بڑھنے کا یہ تقاضا ہونا ہی چاہیے ورنہ ہم اس کو زوال مانیں ہی کیوں؟......کہ دورِ زوال کی اپنی یادگاریں ہوا کرتی ہیں اور دورِ عروج اپنی مثالیں رکھتا ہے......

چنانچہ اس بحران کا اعتراف کرنے میں ہرگز ہمیں تامل نہیں بلکہ یہ بھی ہمارے مقدمے case کا ایک حصہ ہے مگر یہ کہ ہمیں اس تسلسل کا حصہ بننے کی اب ضرورت نہیں جو اُمت کے بھلے دنوں میں عالم اسلام کی روح رواں تھا اور مشرق تا مغرب جو علم، ایمان

---

(۱) سورۃ لقمان (۱۵) ’’پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے‘‘ (ترجمہ مولانا مودودی)

(۲) ’’راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا، نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر (تیرا) غضب ہوا اور نہ وہ جو راہ ہی بھٹک گئے‘‘۔

اور عمل کا ایک حسین ترین اور متوازن ترین نمونہ پیش کرتا رہا تھا، اور جو نصف کرۂ ارض پر خدائے وحدہ لاشریک کی عین اس بندگی کا نقشہ پیش کرتا تھا جو کہ اس کی جانب سے اتری ہوئی وحی کا تقاضا تھا......سو یہ کہ اتباع کا یہ نمونہ اور تالیف و اجتماعِ اُمت کا یہ نقشہ اور اندرونی و بیرونی سطح پر باطل کی سرکوبی کا یہ اسوہ اپنانا اور اس کا ایک باقاعدہ تسلسل بننا اب ہماری ضرورت نہیں اور یہ کہ اپنا راستہ اب ہم اس تاریخی تسلسل سے بے نیاز رہ کر بھی بنا سکتے ہیں......تو یہ سوچ اور ذہنیت دراصل اس دورِ انتشار ہی کی عکاس ہے اور اس بحران کا ہی ایک تسلسل۔

سلف کی راہ ہمیں اس دور میں بھی بلکہ ہر دور میں ہی ایک ایسی بنیاد فراہم کرتی ہے جو مستحکم ہے اور جس پر اہلسنت کے مختلف گروہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے بھی مل کر اور جم کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اصول اہلسنت کی صورت میں یہ راہ ہمارے لئے ہمیشہ کیلئے محفوظ ہے۔ اس میں وحدت و یگانگت کے خدوخال بھی بہت واضح ہیں، اختلاف کی حدود بھی اور باطل کے ساتھ اندرونی و بیرونی کشمکش کا میدان بھی۔ علم، ایمان، عبادت، تزکیہ، تربیت، معاشرہ، تہذیب، سیاست، خلافت، جماعت، وحدت، اصلاح، جہاد، دعوت، امر بالمعروف، اہل بدعت سے تعامل، اُمت پر آنے والے مختلف ادوار اور تغیرِ حالات کی نسبت سے مختلف احکام اور مسائل، اور اس میں قابلِ رجوع اصول اور ضوابط ...... اصول اہلسنت میں ہمیں سب کچھ ملتا ہے۔

اُمت کے دورِ اول (یعنی دورِ سلف) کی اتباع کرنے کی دعوت دیتے ہوئے اور پھر ہر دور میں دورِ اول کی اتباع کرتے رہنے والوں (جن کو کہ متبعین سلف یا اہلسنت کہا جاتا ہے) کی راہ پر چلنے اور اسی کا تسلسل بننے کی دعوت دیتے ہوئے ...... ہمارا مقصد یہ نہیں کہ اب ہر 'نئی بات' اور ہر 'نیا کام' کرنے پر پابندی لگ جائے گی اور یہ کہ اپنے دور کے مطابق کوئی لائحہ عمل تجویز کرنے پر سر کھپانا یا

اپنے دور کے کسی فقہی مسئلے یا کسی سماجی معضلے کا حل پیش کرنا ہی غلط ہو جائے گا، جو کہ اہلسنت کی اصطلاح میں ''نوازل'' کہلاتے ہیں اور جو کہ مختلف ادوار میں مختلف انداز کے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔ یا حتی کہ اپنے دور کے مطابق لائحہ عمل اختیار کرنے یا وقت کے کسی مسئلے کا حل پیش کرنے کے معاملہ میں ''اجتہاد'' کرنا ممنوع ہوگا یا کسی دوسرے کو اجتہاد کا حق دینا یا حتی کہ اجتہاد میں غلطی کر لینے پر کسی کو عذر دینا اور اس باب میں اختلاف کو قبول کرنا ممنوع ٹھہرے گا!

ہماری اس دعوت کا ہرگز یہ مطلب نہیں، جیسا کہ بعض ذہنوں میں یہ غلط فہمی جنم لے سکتی ہے۔ بلکہ یہ بات خود ''اصول اہلسنت'' سے ہی متصادم ہے۔خود صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چھوڑے ہوئے کتاب وسنت کے اصولوں کی بنیاد پر اور اپنے دور کے مسائل اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور پھر نئے نئے انحرافات اور مبنی بر بدعت رجحانات کے بالمقابل جہاں فقہی مواقف اختیار کرنے کی ضرورت تھی وہاں فقہی مواقف اختیار کئے اور وہاں اپنے مابین اختلافِ فہم واجتہاد کو بھی کھلے دل سے قبول کیا اور جہاں عقائدی مواقف اپنانا ضروری تھا وہاں عقائدی اور اصولی مواقف اپنائے اور وہاں وہ سب یک آواز دیکھے گئے اور اپنے مابین اختلاف نام کو بھی نظر نہ آنے دیا۔ یوں اصول اور فروع کو شریعت سے لینے اور ان کو بنیاد بنا کر چلنے کے معاملہ میں امت کے اندر ایک باقاعدہ منہج پر امت کے صالح اور اہل حق طبقوں کیلئے ایک رخ متعین کردیا۔صحابہ کے پڑھے ہوئے تابعین نے پھر اسی کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے زمانے کے مطابق طرز عمل اختیار کیا اور عین انہی خطوط پر اپنے فہم وفقہ اور اپنے تطبیقِ فکر وعلم کو زبردست توسیع دی۔اَتباع تابعین (جن میں کہ ائمۂ اربعہ اور بیشتر ائمۂ حدیث آتے ہیں اور جن کے دور میں فقہ کا پھیلاؤ ہوا اور علوم کی تصنیف اپنے عروج کو پہنچی) نے پھر اسی چیز کا تسلسل بنتے ہوئے اپنے دور کی علمی وفقہی وفکری ضروریات پوری کیں اور اپنے دور کے فتنوں اور بدعتوں کے مدمقابل اپنے عقائدی اور اصولی مواقف رقم کئے......

اور نسل در نسل پھر یہ سلسلہ چلتا رہا...... البتہ یہ ایک سلسلہ تھا نہ کہ ہر ذہین شخص کے اپنے صغریٰ وکبریٰ جات۔

ایک عدالت میں آنے والا ہر کیس اپنی نوعیت میں گو دوسرے ہر کیس سے مختلف ہوسکتا ہے اور اس کے باعث ہر نئے کیس کا فیصلہ دوسرے سے مختلف اور نیا ہونا متوقع ہوسکتا ہے اور اس لحاظ سے حاضر وقت عدالتوں اور قاضیوں کا کردار کسی بھی وقت حاشیائی نہیں ہوسکتا پھر بھی نئے آنے والے مقدمات کی بابت وقت کی عدالتیں گزشتہ عدالتوں کے کیے ہوئے مقدموں کے فیصلوں کو مدنظر رکھنے کی پابند ہوتی ہیں جن کو کہ نظائر Precedents کہا جاتا ہے۔ ''قانون'' کتابوں میں بے شک موجود ہو مگر عدالتی نظام اس مفروضہ کو درست نہیں سمجھتا کہ کوئی جج دنیا میں آج پہلی بار 'عدل' قائم کرے گا اور یہ کہ کوئی شخص آج پہلی بار ہی قانون کا 'صحیح فہم' پائے گا! عدالتی نظام جج کا تعین بلکہ کرے گا ہی اس صورت میں جب وہ اس میدان میں ''اپنے سے پہلوں'' predecessors کی حیثیت کا اعتراف کرے اور ان کے تسلسل کو لے کر چلنا قبول کرے ...... ورنہ وہ عدالتی نظام 'نظام' نہیں کہلائے گا۔ اس کو 'سلسلہ' نہیں کہا جائے گا۔

'نئے' کا امکان بھی ختم نہ ہو اور 'پرانے' کی حیثیت اور اہمیت بھی مسلم رہے، ایک 'تسلسل' سے ہماری یہی مراد ہے...... افکار کی دنیا میں یہ حُسن صرف منہجِ اہلسنت کو میسر ہے۔

اب یہ 'سلف' جس چیز کا نام ہے وہ Predecessors کا ہی لفظی ترجمہ جس کا عدالتی تشریح کے ضمن میں اوپر ذکر ہوا۔ ایک سلسلہ کو جو چیز ''سلسلہ'' بناتی ہے وہ Predecessors کا ہی التزام ہے۔ ''قانون'' تو ہمارے لئے اور رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کیلئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ ہے مگر ہر دور میں سلف کی راہ پر چلتے آنے والوں کی راہ پر چلنا اور ان کے فہم و فقہ کا التزام کرنا دراصل نظائر

Precedences کی اتباع ہے جو کہ ''بعد والوں'' کو ''پہلوں'' کے ساتھ جوڑ دیتی ہے اور سب کو ایک ہی آسمانی حقیقت کا مجموعی تسلسل بنا دیتی ہے۔

والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضى الله عنهم...... (التوبۃ:۱۰۰)

''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا......'' (۱)

کیا یہ بات بے انتہا قابل توجہ نہیں کہ تاریخ اسلام میں ایک پوری نسل کا نام 'تابعین' رکھ دیا جاتا ہے اور قیامت تک ہم ان کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد کی نسل کو 'اَتباعِ تابعین' کہتے ہیں؟ کیا اپنے دین کی فطرت اور مزاج کو سمجھنے کیلئے یہ ایک بہت کافی بنیاد نہیں؟

کتاب وسنت کو ''سمجھنا'' بلاشبہ ہم نے بھی ہے، کہ اس کو سمجھے بغیر ہدایت پانا ممکن ہی نہیں۔ مقصد یہ نہیں کہ کتاب وسنت کو پہلوں نے سمجھ لیا تو اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہم خیر سے کوئی اور کام کریں! دین کا فہم لئے بغیر ہرگز کوئی چارہ نہیں مگر اس کا ''فہم'' ہمیں ''سلف'' سے اور ''سلف کی راہ پر چلتے آنے والوں'' سے لینا ہے۔ انہی کے اصولوں سے مدد لینی ہے اور اُمت کے اندر انہی کے ''تسلسل'' کا حصہ بننا ہے۔

ہمارے اس رسالہ کا، بلکہ حق تو یہ ہے ہماری پوری دعوت کا، یہی اصل لب لباب ہے۔ راستے کے بہت سے گڑھوں میں گرنے سے بچاؤ کا پیشگی بندوبست اسی منہج کو اختیار کرنے میں مضمر ہے۔ بہت سے 'دلکش' مناہج اس کے سوا آپ کو 'قائل' بلکہ اپنے 'دلائل' سے گھائل کرنے کو ہر زمانے میں موجود ہوں گے، بڑا کچھ یہاں بنتا اور بگڑتا رہے گا اور کئی عمارتیں یہاں کچھ دیر کیلئے بڑی اونچی جاتی اور پھر کسی نئے تعمیر ساز کی عمارت کو جگہ دینے کیلئے بڑی بے چارگی سے ملبہ بنتی دیکھی جائیں گی، کئی ایک فتنے زبان

(۱) ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی

زد عام ہو جانے کے بعد بالآخر زمانے کی گرد میں روپوش ہو رہیں گے اور بڑا غلغلہ کرا لینے کے بعد زیادہ ہوا تو لائبریریوں کی شیلفوں میں 'مطالعہ نگاروں' کے منتظر رہ جائیں گے، مگر وہ چیز جس کو چودہ صدیوں سے دوام حاصل ہے اور کبھی اس کا سرنگوں ہونا ممکن نہیں اور جس سے ٹکرانے والا ہر شہ زور بالآخر چت ہوا، وہ اہلسنت کا منہجِ فہم و اتباع ہے جس میں اصول اور فروع، التزام اور اجتہاد، اتفاق و اجماع اور تعدد آرا، وحدت و یکسانیت اور تنوعِ افکار سب کی حدود متعین ہیں اور جن کو اصحاب رسول اللہ ﷺ سے نہ صرف باقاعدہ تلمذ بلکہ سندِ توثیق پا رکھنے کا شرف حاصل ہے۔

کسی راستے کا نیا ہونا، اس امت کے اندر، اس کے ٹھکرائے جانے کیلئے ایک بہت کافی اور معقول بنیاد ہے۔ اس کے سوا، اس کو مسترد کر دینے کیلئے، کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں، 'نیا' ہونے کے سوا اگر اس کے رد کر دینے کیلئے کوئی اور دلیل دی جائے گی تو وہ نفل کے باب سے ہوگا نہ کہ فرض کے باب سے۔ 'اتباعِ حق' کا عمل اس امت کے اندر اس قدر تسلسل کے ساتھ ہوا ہے اور نسل در نسل اور کڑی در کڑی اس شدید حد تک مربوط ہے اور کہیں رکے یا روپوش ہوئے بغیر اصحابِ رسول اللہؐ سے سیدھا بے ساختہ یوں جا ملتا ہے، کہ 'پہلوں' کے ذخیروں سے ایک بات کا ثبوت نہ دیا جا سکنا اور ایک مکتبِ فکر کا محض 'تحقیق' کے نتیجے میں سامنے آ جانا اس کے محدَث اور 'فَھُوَ رَدٌّ' ہونے پر مہرِ تصدیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ امتِ محمد ﷺ ہے کوئی مذاق نہیں!!

ائمۂ اہلِ سنت نے کیا سچ کہا، انقطاع _ یعنی دین کی کسی تعبیر کا پورے ایک تسلسل کے ساتھ پیچھے نہ جا سکنا _ اس کے باطل ہونے کیلئے کافی اور بجائے خود ایک دلیل ہے۔

من یھدہ اللہ فلا مضل لہ، و من یضللہ فلا ھادی لہ

□□□□□□

تقسیم عام کیلئے، یہ مضمون علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں، سستی چھپائی کے ساتھ، دستیاب ہے

منہجِ سَلَف کو لازم پکڑنا

'دِین' کی تحقیق یا 'دِین' کی بابت بحث یا تبادلۂ آراء کا سَلَفِی منہج کیا ہے؟

جہاں تک دِین کی بنیادوں کا تعلق ہے: جیسے مثلاً دِین کے عقائد، دِین کے بنیادی فرائض، حتی کہ عام حلال وحرام، اوامر ونواہی اور جائز وناجائز کے وہ امور جن کی بابت قرونِ ثلاثہ میں ہرگز ایک سے زیادہ رائیں نہیں پائی گئیں ___ اور ظاہر ہے کہ دِین کے ایسے اُمور ایک بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، اور دِین کے اِس حصہ کو 'اُصول دِین' بھی کہا جاتا ہے ___ تو دِین کے ان اُمور کی بابت:

- نہ تو بحث جائز ہے،
- نہ اختلاف،
- اور نہ 'از سرِ نو تحقیق'۔

''اصول دِین'' کے معاملہ میں نصوصِ شریعت کے 'فہم' کی بابت جو کچھ سلف سے منقول ہے وہی حق ہے اور اسی کو ماننا واجب۔ اس کے ماسوا باطل ہے اور بدعت وضلالت۔ ان معاملات میں 'بعد والوں' پر کچھ فرض ہے تو وہ یہ کہ 'پہلے والوں' کی راہ پر

(۱) ''سَلَف سے مراد ایک بار پھر ذکر کر دیا جائے:
اسلام کے پہلے تین ادوار: صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین، خصوصاً ان تین ادوار کے ائمۂ علم، فقہاء ومحدثین۔

چلیں۔ بقول عبداللہ بن مسعودؓ: علیکم بالأمر العتیق[1]۔

بہت سے بکھیڑے تو اپنے یہیں سمٹ جاتے ہیں۔

رہ گئے وہ اُمور جو بنیادی عقائد اور بنیادی فرائض میں نہیں آتے نیز حلال وحرام اور جائز وناجائز کے وہ اُمور جن میں صحابہ وتابعین وائمۂ اتباع تابعین کے ہاں تعدد آراء پایا گیا ہو، اور جو کہ ''فروعِ دین'' شمار ہوتے ہیں، تو اختلاف کی جتنی گنجائش ان (سلف) کے ہاں پائی گئی گنجائش کا وہی دائرہ ہماری تحقیق اور تنقیح کیلئے بھی باقی رہے گا۔ یہ دائرہ جس کو 'فروعِ دین' کہا جاتا ہے، اس میں:

- تحقیق اور بحث کی گنجائش ہے،
- راجح ومرجوح اور صحیح وغیر صحیح کا تعین بھی دلیل کی قوت کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے، اور
- کسی قابلِ اعتماد شخص (امام، عالم) کی تحقیق پر بھی اعتماد کیا جاسکتا ہے، خواہ اس ''اعتماد کرنے'' کو آپ کوئی بھی نام دیں۔

ہاں یہ بات بے حد واضح رہے کہ اس ''فروعِ دین'' والے دائرہ میں بھی 'تحقیق' کیلئے ایک خاص درجہ کی علمی اہلیت مطلوب ہے۔ نہ صرف علمی اہلیت، بلکہ دورِ صحابہ وتابعین وتبع تابعین کے ائمۂ علم کے منہج کا عمومی التزام بھی۔ لہٰذا ایک عام آدمی تو ___ جو اس اہلیت کا حامل نہیں ___ بہر حال اس بات کا مجاز نہیں کہ وہ اپنی 'تحقیق' کے نتائج اُمت کے سامنے لائے اور ایسا کرکے اُمت کو خواہ مخواہ پریشان اور خراب کرے، خواہ مسئلہ 'فروع' سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ اس کو چاہیے وہ یہ کام ان لوگوں پر چھوڑ دے جو اس کے اہل ہوں۔ علاوہ ازیں، وہ (ایک عام آدمی) جب کسی اہل علم سے رجوع کرے تو بھی یہ دیکھے آیا وہ اہل علم، اصول اور فروع کے معاملہ میں، قرونِ ثلاثہ کے اس دائرہ کا (جس کا اوپر ذکر ہوا) پابند ہے یا نہیں۔

---

(۱) ''پرانے ترین دور والے اسلام ہی کو لازم پکڑے رہو''

چنانچہ ''اصول دِین'' میں تو کسی کے کلام کرنے کی گنجائش ہی کیا بے شک کوئی شخص تحقیق اور اجتہاد کی اہلیت بھی کیوں نہ رکھتا ہو...... حتی کہ ''فروع دِین'' کے اندر بھی ایک ایسا آدمی جو علمِ دِین میں ایک خاص درجہ کی علمی اہلیت نہیں رکھتا خدا کے دِین میں کلام کرنے کا ہرگز مجاز نہیں۔ اس کو تو بس یہ چاہیے کہ:

۱) جہاں تک ''اصولِ دین'' کا معاملہ ہے تو وہاں صرف اور صرف سلف کے متفقہ فہم ہی کو اختیار کرے

۲) اور جہاں تک ''فروع'' کا معاملہ ہے تو اس میں کسی صاحبِ علم پر اعتماد کرے اور اگر ہو سکے تو اس صاحبِ علم کی دلیل اور حجت کے معاملے میں بصیرت حاصل کرے، نہ ہو سکے تو اللہ کسی کو اس کی استطاعت سے بڑھ کر مکلّف نہیں ٹھہراتا۔ البتہ سب لوگوں پر 'اپنے' اُسی صاحبِ علم سے رجوع کرنے کا تقاضا نہ کرے بلکہ دوسرے اگر کچھ دیگر اصحاب وائمۂ علم پر سہارا کرتے ہیں (بات فروعِ دین کی ہو رہی ہے) تو دوسروں کو دیگر اصحابِ علم پر اعتماد کرنے دے۔

ترجمانِ مذہبِ سلف حافظ ابن عبدالبر (۳۶۸ھ......۴۶۳ھ) کی مشہور تصنیف ''**جامع بیان العلم وفضله**'' سے اس سلسلہ میں چند اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''سلف نے اس بات سے ممانعت فرمائی ہے کہ خدا تعالیٰ کے بارے یا اس کے اسماء وصفات کے بارہ میں بحث اور اختلاف ہو۔ البتہ جہاں تک فقہی مسائل کی بات ہے تو سلف کا اتفاق ہے کہ ان امور میں بحث اور اخذ ورد ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ (فقہ) ایک ایسا علم ہے جس میں اس بات کی احتیاج ہے کہ بوقت ضرورت فروع کو اصول کی جانب لوٹایا (قیاس کیا) جائے۔ جبکہ اعتقادات کا معاملہ ایسا نہیں کیونکہ اہلسنت والجماعت کے نزدیک اللہ عزوجل کی بابت کوئی بات کی ہی نہیں جا سکتی سوائے اس بات کے جو وہ خود ہی اپنی ذات کے بارے میں بیان کر دے، یا جو رسولؐ اس کی بابت بیان کر دے، یا جس پر اُمت نے اجماع کر لیا ہو۔ خدا کی مثل کوئی چیز ہے ہی نہیں جس کا کہ، قیاس کے ذریعے یا گہرے غور وخوض کے نتیجے میں، ادراک ہو جایا کرے......

''دِین اس معنی میں کہ وہ اللہ پر ایمان ہے، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور بعث بعد الموت اور یوم آخرت پر ایمان ہے تو اس تک رسائی تو خدا کے فضل سے اس کنواری دوشیزہ کو بھی حاصل ہے جس کو کبھی گھر سے باہر کی ہوا تک نہ لگی ہو۔

(دِین کے اسی پہلو، یعنی ''اصولِ دین'' کی بابت) عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول ہے: جو شخص اپنے دین کو بحثوں کا موضوع بناتا ہے پھر وہ اکثر نقل مکانی کرتا ہے''

(صحیح جامع بیان العلم وفضلہ ص ۳۸۳)[۱]

کچھ آگے چل کر ابن عبدالبر صحابیؓ رسولؐ حذیفہ بن الیمانؓ کا قول نقل کرتے ہیں:

''تمہارا بھٹک جانا اور صحیح معنوں میں بھٹک جانا یہ ہے کہ پہلے جس بات کو تم منکر جانتے تھے اب اس کو معروف جاننے لگو اور پہلے جس بات کو معروف جانتے تھے اس کو اب منکر جاننے لگو۔[۲] خبردار خدا کے دین میں نئے نئے رخ اختیار نہ کرو۔ کیونکہ خدا کا دِین ایک متعین چیز ہے۔

(صحیح جامع بیان العلم وفضلہ ص ۳۸۴)

یہ تو رہا اصول دِین کا معاملہ۔ رہ گئے فروع دِین تو اس میں استدلال اور استخراجِ مسائل ضرور ہوسکتا ہے مگر اس کے بھی باقاعدہ اصول اور قواعد ہیں۔ دِین کے اِس حصہ میں بات کرنے اور رائے دینے کیلئے بھی ضروری ہے کہ آدمی نہ صرف استدلال کے ان فقہی اُصولوں سے واقف ہو بلکہ نصوص شریعت کا بھی باقاعدہ علم رکھتا ہو حتی کہ وہ اس بات سے بھی آگاہ ہو کہ کسی موضوع پر صحابہ وما بعد کے اہل علم کے اختلافات اور اقوال اگر منقول ہیں تو وہ کیا ہیں۔

(۱) صحیح جامع بیان العلم وفضلہ۔ تالیف الامام الامام ابی عمر یوسف بن عبدالبر۔ اختصار وتھذیب ابو الاشبال

(۲) یعنی صحابہ کے ماحول میں جس چیز کو حق جانا جاتا تھا، آدمی کا بزعم خود کسی 'دلیل' کی بنیاد پر، یا کسی کے بہکانے کے زیر اثر، اسے غلط جاننے لگنا اور جس چیز کو صحابہ کا علم وعمل غلط قرار دیتا رہا ہو، اس کو درست جاننے لگنا۔

امام محمد بن الحسنؒ کہتے ہیں:

''جو شخص کتاب اور سنت کا علم رکھتا ہے، اصحاب رسولؐ کے اقوال سے واقف ہے اور فقہائے مسلمین کے اقوال سے آگاہ ہے وہی اس بات کا مجاز ہے کہ کوئی مسئلہ اس کے سامنے پیش آئے تو وہ اجتہاد کر کے کوئی رائے اختیار کرے اور اپنی اس رائے کو اپنی نماز یا اپنے روزے یا اپنے حج یا شرعی اوامر ونواہی کے کسی معاملہ میں قابل عمل جانے''

(جامع بیان العلم وفضله......)

چنانچہ فروع کے اندر بھی آپ جس اہل علم سے دِین سمجھیں گے اور اس کی تحقیق یا اجتہاد پر اعتماد کریں گے اس میں یہ شروط پائی جانا ضروری ہیں جن کا ذکر امام محمدؒ کے قول میں اوپر گزرا ہے۔ رہ گیا وہ شخص جو علم کے اس درجے پر نہیں وہ یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ قرآن یا حدیث کی کتب کھول کر ___ خواہ فروعِ دِین ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو ___ لوگوں کو دِین کے مسئلے بتائے الا یہ کہ وہ خود بھی کسی معتبر صاحب علم کی تحقیق پر اعتماد کرے اور اس سے ایک مسئلہ پڑھ کر یا اس سے لے کر آگے لوگوں کو پڑھائے۔

عن ابن بريدة عن أبيه، عن النبی صلى الله عليه وسلم قال: القضاة ثلاثة. قاض فی الجنة واثنان فی النار. قاض عرف الحق فقضى به فذلک فی الجنة. وقاض قضى بالجهل فذلک فی النار، وقاض عرف الحق وجار فی الحكم فهو فی النار

(ابن ماجة ۲۳۸۱، ومثله فی ابی دائود ۳۵۷۴، وفی الترمذی ۱۳۲۰)

ابن بریدہؓ سے روایت ہے، وہ اپنے والد (بریدہؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قاضی تین طرح کے ہیں۔ ایک جنتی اور دو دوزخی۔ ایک قاضی وہ ہے جو حق کا علم رکھتا ہے اور پھر اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ یہ جنتی ہے۔ ایک قاضی وہ ہے جو جہالت کی بنا پر فیصلہ دیتا ہے۔ یہ دوزخ میں جائے گا۔ ایک قاضی وہ ہے جو حق کا علم تو رکھتا ہے مگر فیصلہ (پھر بھی) ظلم پہ کرتا ہے۔ یہ بھی دوزخی ہے''۔

مذکورہ حدیث کے حوالہ سے قتادہؒ کہتے ہیں: میں نے ابوالعالیہؒ سے دریافت کیا: آخر اس شخص کا کیا قصور جس نے اجتہاد کیا اور اجتہاد میں غلطی کر لی؟ ابوالعالیہؒ نے جواب دیا: اس کا قصور یہ ہے کہ جب اس کو علم نہیں تو وہ فیصلہ دینے ہی کیوں بیٹھا''۔

(السنن الکبری للبیهقی ج۱۵ص۹۸)

□□□□□□

کتاب وسنت کے فہم کا یہ اصولی طریقہ نہ اپنایا جائے تو پھر دین کے ہر معاملے میں ہر وقت بات کرنے کی گنجائش باقی ہے اور کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ہر کوئی ہی اس پر تب طبع آزمائی کرے گا، جیسا کہ اس وقت عملاً ہو بھی رہا ہے اور جس کی طرف پیچھے ہم کچھ اشارہ کر آئے ہیں۔

دِین کے باب میں کیا کسی بھی بات اور کسی بھی مسئلے کو کوئی بھی شخص کسی بھی وقت چیلنج کر دے اور شرعی نصوص کے کچھ حوالے دے کر اپنے تئیں اس پر کچھ 'دلیلیں' لے آئے تو سب کام چھوڑ کر ہم اس پر بحث کرنا شروع کر دیا کریں؟

ایک ایسی زمین جس پر ہم پیر جما کر چل لیں اور پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھیں اور پوری دلجمعی کے ساتھ زمانے کی دوڑ میں شریک ہوں......اور جس میں چلتے ہوئے پیر پیر پر ہم لامتناہی بحثوں کے سلسلے لے کر نہ بیٹھ جایا کریں، ہماری سب سے پہلی ضرورت ہے بلکہ بہت ہی بنیادی ضرورت۔

منہج سلف اور اصول اہلسنت دراصل ہماری اسی ضرورت کا نام ہے۔

یہ ایک متوازن ترین منہج ہے۔ یکسانیت uniformity اور تنوع diversity کے مابین جو کوئی بہترین توازن ہوسکتا ہے وہ اس منہج میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اتباع اور اجتہاد میں جو کوئی بہترین نسبت تناسب ممکن ہے، وحی اور عقل کا جو کوئی بہترین سنگم ہوسکتا ہے وہ آپکو منہج سلف اور اصول اہلسنت میں ملتا ہے۔ بیک وقت ایک جانب ابداع novelty اور ابتکار creativity اور دوسری جانب تسلیم

submission اور اذعان surrender اپنی بہترین حالت میں پائے جاتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ آپ سے آپ اور بے ساختہ پائے جاتے ہیں اور لے کر دور اول سے آج تک بغیر کسی انقطاع کے پائے جاتے ہیں۔

حیرانی اور سرگردانی واقعتاً قوموں کو ناکارہ کر کے رکھ دیا کرتی ہے۔اس کا سدباب ہمارے دِین میں ہم کو منہج سلف کا پابند کر کے باحسن طریق کر دیا گیا ہے۔

□□□□□□

کیا واقعتاً ہمیں منہجِ سلف کا پابند کیا گیا ہے؟

اب یہاں ہم منہج سلف کو اختیار کرنے کے لزوم پر کچھ مختصر گفتگو کریں گے۔

مقدمہ فی اصول التفسیر میں امام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

”یہ بات جان لی جانا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو جس طرح قرآن کے الفاظ بیان کر کے دیے ویسے ہی اس کے معانی بھی واضح کر کے دیے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (**لتبین للناس ما نزل الیھم** (النحل:۴۴) ”تا کہ تم لوگوں کے سامنے وہ تعلیم جو تم پر اتاری گئی کھول کر بیان کر دو) میں جہاں وہ بات آتی ہے وہیں یہ بات آتی ہے۔

”ابوعبدالرحمٰن السُّلمی کہتے ہیں: وہ لوگ جو ہمیں قرآن پڑھایا کرتے تھے، مثلاً عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، وہ ہمیں بتایا کرتے تھے کہ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سبق میں لیتے تو اس وقت تک اگلے سبق پر نہ جاتے جب تک وہ ان دس آیات میں علم اور عمل کی ہر بات سیکھ نہ لیتے۔ کہا کرتے تھے: سو یوں ہم نے قرآن سیکھا تو (اسکا) علم اور عمل ایک ساتھ سیکھا“۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ایک سورت کے حفظ میں مدت گزار دیا کرتے تھے۔

(**مقدمہ فی اصول التفسیر** ص ۳۵)

ابوعبدالرحمٰن السلمی (**عبداللہ بن حبیب الکوفی**) ان کبار تابعین میں سے ایک ہیں جو صحابہ سے قرآن سیکھتے رہے ہیں جیسا کہ اوپر مذکور ان کی اپنی ہی روایت

سے ظاہر ہے۔اب یہ تابعی اپنے استاد صحابہ کا احوال خود ان کی اپنی زبانی بتارہے ہیں کہ وہ (صحابہ اساتذہ) خود اپنے استاد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے محض قرآن کے الفاظ نہیں بلکہ قرآن کے الفاظ اور معانی ومفاہیم بیک وقت سیکھتے تھے......اور یہ کہ قرآن کی بابت ان کا علم اور عمل بیک وقت مکمل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرنگرانی ہوا۔

چنانچہ صحابہ وتابعین کا یہ علمی، فکری اور نظریاتی تسلسل جو بعد کی نسلوں کیلئے محفوظ ہوا اور اپنے بعد آنے والوں کیلئے ایک متعین جہت اختیار کر گیا وہ سب کیلئے ایک مثال ٹھہرا۔نصوصِ وحی سے استدلال کا کیا منہج اختیار کرنا ہے اور دِین کے اصول اور فروع کو کیونکر لینا ہے، اتفاق اور اختلاف کے کیا حدود اور ضوابط رکھے جانا ہیں اور ان معاملات میں کن آداب کو اپنایا جانا ہے، اتباع اور اجتہاد کو کیونکر مجتمع رکھنا ہے، 'غلطی' اور 'انحراف' میں کیونکر فرق کرنا ہے، وحدتِ صف کا کیا طریق کار ہے اور بدعات ومحدثات کے خلاف کیونکر محاذ بنانا ہے...... یہ سب کچھ ہمیں ان لوگوں سے لینا ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا عملی سبق پڑھا اور پھر آگے اسی دیانت کے ساتھ یہی سبق بعد والوں کو پڑھایا۔

بنیادی طور پر یہ ایک مدرسہ ہے جس میں صحابہ پڑھے اور پھر آگے پڑھاتے رہے اور پھر صحابہ سے پڑھنے والے صحابہ سے پڑھ پڑھ کر اپنے بعد والوں کو پڑھاتے رہے۔ دِین کی حقیقت، دِین کی فطرت، دِین کا مزاج، دِین کے اصول وفروع کی حدود، قواعدِ استنباط اور یہ کہ کہاں تعددِ آراء کی گنجائش چھوڑ دی جانا ہے البتہ کہاں اختلاف ہو جانے پر چہروں کو لال پیلا ہو جانا ہے......غرض نصوصِ وحی کے ساتھ تعامل اختیار کرنے کی سب تفصیلات جو کہ دراصل ایمان کی ہی عملی تفصیلات ہیں یہ ہمیں اسی مدرسہ سے لینی ہیں جس میں صحابہ پڑھے۔ جس میں پھر صحابہ پڑھاتے رہے۔اور جس میں پھر صحابہ کے پڑھے ہوئے پڑھاتے رہے۔

فإن أمنوا بمثل ما آمنتم به فقداهتدوا وان تولوا فانماهم في شقاق (البقرہ:۱۳۷)

"اگر وہ تم جیسا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں، اور اگر منہ موڑیں تو وہ صریح اختلاف میں ہیں"۔ (ترجمہ حافظ محمد جونا گڑھی)

صحابہ کے ایمان جیسا ایمان، صحابہ کی اتباع جیسی اتباع، جس طرح صحابہ نے دین کو سمجھا عین اُسی طرح اور اُسی طرز پر دین کو سمجھنا اور جس طرح صحابہ دین پر عمل پیرا ہوئے عین اسی طرح دین پر عمل پیرا ہونا قرآن کا حکم ہے اور دین کا ایک باقاعدہ مطالبہ۔

عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة كلهم في النار إلا ملة واحدة. قال: ومن هي يا رسول اللہ؟ قال: ما أنا عليه وأصحابي

(الترمذی: ۲۷۱۱)

"بروایت عبداللہ بن عمرؓ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اور میری یہ اُمت تہتر ملتوں میں بٹے گی۔ سب دوزخی ہوں گی سوائے ایک۔ سوال کیا: وہ ایک کونسی اے اللہ کے رسولؐ؟ فرمایا جو اس امر پر ہوگی جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں صرف اتنا نہیں فرمایا کہ "ما أنا عليه" یعنی "وہ راستہ اور منہج جس پر میں ہوں" حالانکہ یہیں پر رکنا چاہتے تو رک جاتے ...... بلکہ اس دور کے لوگوں کیلئے جس میں تفرقہ ہوگا فرمایا: ما أنا عليه وأصحابي "وہ راستہ اور منہج جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں"۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱) صحابہ کا منہج اور صحابہ کا فہمِ دِین، نصوصِ وحی کو لینے اور سمجھنے کے معاملہ میں، بعد والوں کیلئے حجت ہے اور وحی کے استیعاب کی بابت ایک پیمانہ ومقیاس

کا درجہ رکھتا ہے۔ دِین کے معاملہ میں وہ مسلمات جو صحابہ کے ہاں قائم ہو گئے اور حق و باطل کی جو بنیادیں اور نصوصِ وحی سے استدلال کے جو اصول ان کے دور میں قائم ہو گئے ...... بعد والے، خصوصاً وہ لوگ جو اختلاف اور تفرقہ کے دور میں پائے جائیں گے، انہیں بنیادوں اور انہی مسلمات اور انہی اصولوں کو اپنانے اور انہی پہ کاربند رہنے کے پابند ہیں (مذکورہ بالا حدیث ما أنا علیه واصحابي کی رو سے، کیونکہ یہ حدیث ہے ہی 'اختلاف' اور 'فرقہ جات' کے دور کی بابت) اور ایسا کرنے والے ہی تفرقہ و ہلاکت سے نجات پانے والا گروہ شمار ہوں گے۔

۲) دوسری بات جو اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ صحابہ کا منہج اور اُن کا فہمِ دین بعد کے ادوار کیلئے باقاعدہ طور پر باقی اور محفوظ بھی رہے گا اور نسل درنسل چلے گا۔ بصورت دیگر اس کو بعد کے ادوار کیلئے، خصوصاً اس دور کیلئے جب 'تہتر فرقے' پائے جائیں گے، ایک پیمانہ اور ایک مقیاس قرار دینا اور نجات کی بنیاد بتانا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ ایک چیز اگر بعد والوں کیلئے باقی ہی نہیں رہنی تو اس کو نجات پانے والوں کی پہچان قرار دینا چہ مفہوم دارد؟

پس اس حدیث کی اپنی ہی دلالت ہے کہ وہ راستہ اور منہج جس پر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ پائے گئے وہ قیامت تک آنے والی نسلوں کیلئے کسی نہ کسی انداز میں اپنا تسلسل بھی جاری رکھے گا اور حجت بھی ٹھہرے گا۔ جو چیز محفوظ نہ ہو آخر وہ حجت کیونکر ہو سکتی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ مجموع فتاوی میں کہتے ہیں:

"فرمان الٰہی ہے:

والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه اعدلهم

جنات تجری تحتها الانهار خالدین فیها ابدا ذلک الفوز العظیم

"مہاجرین وانصار کے سابقین اولین اور وہ لوگ جو احسان وخوش اسلوبی سے ان کے پیچھے چلے اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں، اللہ نے ان کیلئے جنتیں اور باغات تیار کئے ہیں، جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی عظیم کامرانی ہے"۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے پیچھے چلنے والوں کو بھی اپنی خوشنودی اور جنت کی نعمتوں میں شریک کردیا...... اس لئے جو لوگ سابقینِ اولین کی اتباع کریں گے وہ انہی میں شمار ہوں گے جبکہ یہ لوگ انبیاء کرام کے بعد افضل ترین لوگ ہیں، کیونکہ اُمت محمد ﷺ افضل ترین اُمت ہے جو لوگوں کیلئے نکالی گئی ہے اور یہ لوگ اُمت محمد ﷺ میں افضل ترین ہیں۔ اس لئے علم اور دین میں ان کے اقوال واعمال کی معرفت رکھنا، دین کے جملہ علوم اور اعمال میں متاخرین کے اقوال واعمال کی معرفت سے صد مرتبہ افضل اور مفید تر ہے۔ کہ یہ لوگ اپنے بعد والوں سے افضل ہیں جیسا کہ کتاب اور سنت سے ثابت ہے، پھر جب ایسا ہے تو ان لوگوں کی اقتدا بعد والوں کی اقتدا سے بہتر ہے۔ علم ودین کے سلسلے میں دوسروں کے اجماع ونزاع کی نسبت صحابہ کے اجماع واتفاق اور انہی میں ہونے والے اختلاف کی معرفت ودریافت بہتر اور افضل ہے......

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اجماع بہر حال معصوم ہوتا ہے، صحابہ نے اگر اختلاف کیا ہو تو بھی حق ان کے اقوال ہی میں سے کسی ایک میں ہوتا ہے۔ بنا بریں ان کے اقوال ہی میں حق کی تلاش کی جاسکتی ہے، (جہاں ان کا اختلاف ہوا ہو وہاں بھی) ان کے اقوال میں سے کسی قول کو اس

وقت تک غلط نہیں کہا جا سکتا جب تک کتاب اور سنت سے اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو جائے۔

کیونکہ متأخرین کے بہت سے اصول، اسلام میں محدث اور بدعت شمار ہوتے ہیں جبکہ سلف نے اس سے پہلے اس کے برعکس اجماع کر رکھا ہوتا ہے، پھر اجماعِ سلف کے بعد جو اختلاف پیش آئے تو وہ قطعی غلط اور بے جا ہوتا ہے مثلاً خوارج، روافض، قدریہ، مرجیہ ایسے دوسرے فرقے جن کے اقوال و آراء مشہور و معلوم نصوص کے اور اجماعِ صحابہؓ کے صریح مخالف ہیں۔

اسی طرح دین میں کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں رہ جاتا جس کے بارے میں سلف نے کلام نہ کیا ہو اسلئے اس کی مخالفت یا موافقت میں سلف سے ضرور کوئی نہ کوئی قول مل جاتا ہے''۔

(مجموع فتاویٰ ص ۱۳، ص ۲۳، ۲۷)

امام اوزاعیؒ اس حقیقت کے بیان میں کیا خوبصورت پیرایہ اختیار کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

اِصبِر نَفسَکَ عَلٰی السُّنَّةِ، وَقِف حَیثُ وَقَفَ القَومُ، وَقُل بِمَا قَالُوا، وَکُفَّ عَمَّا کَفُّوا، وَاسلُک سَبِیلَ سَلَفِکَ الصَّالِحِ، فَإِنَّه یَسَعُکَ مَا وَسِعُهم

(شرح اصول اهل السنة و الجماعة للالكائی ۱:۱۵۴)

''جی مار کر اس (اہل) سنت راہ پر جمے رہو۔ ان پہلوں کے قدم جہاں رک گئے ہوں وہاں تم بھی ضرور رُک جاؤ۔ جس بات کے وہ قائل ہوئے ہوں تم بھی اسی کے قائل رہو۔ جس بات سے وہ خاموش اور دستکش رہے ہوں تم بھی اس سے دستکش ہی رہو۔ چلو تو اپنے ان سَلَفِ

صالح کی راہ پر چلو۔ اس لئے کہ گنجائش کا جو دائرہ ان کیلئے رکھا گیا ہے وہی تمہارے لئے ہے"۔

امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں:

اصول السنة عندنا: التمسک بما علیه اصحاب رسول اللّٰه ﷺ والاقتداء بهم، وترک البدع، وکل بدعة فهي ضلالة

(شرح اصول اهل السنة والجماعة للالکائی ۱:۱۵۶)

"اصول (اہل) سنت ہمارے ہاں یہ ہیں کہ ہر وہ امر جس پر اصحاب رسول اللہ ﷺ تھے، اس سے چمٹ کر رہا جائے۔ ان کی اقتدا کی جائے۔ اور نئی ایجادات کو ترک کر رکھا جائے۔ کیونکہ ہر نئی اپج (بدعت) ضلالت ہے"۔

□□□□□□

یہ فہم دین کی بابت صحابہ کی عمومی اور مجموعی روش کی بات ہے۔ مراد یہ نہیں کہ ہر صحابی کا ہر قول شرعی حجت ہے۔ گو امام مالکؒ اپنے اصول فقہ میں قول صحابی کو (جس کے خلاف صحابہ کا کوئی اور قول نہ پایا جاتا ہو) معتبر دلیل شمار کرتے ہیں البتہ ہماری گفتگو 'قولِ صحابی' کی بابت نہیں، بلکہ مجموعی طور پر صحابہ کے فہم دین اور ان کے طریقہ ومنہج اور ان کے اتفاق کردہ امور ومسائل کے بارے میں ہے...... اس کی حجیت پر ائمہ میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں۔

استدلال کے اصول، اعتقاد کے امور، اصول اور فروع میں امتیاز، اجتہاد کے دائرہ کا تعین، سنت اور بدعت میں فرق، ثوابت اور متغیرات میں توازن، اجتماع اور افتراق کے ضوابط، اہل بدعت سے تعامل کی حدود، پھر عبادات، معاملات، حدود، تعزیرات، اخلاق، سماجیات، تہذیب، حلال وحرام، فرائض واوامر ایسے سب کے سب امور میں فہمِ دین کی بابت صحابہ کی اتباع لازم ہے۔

ان سب کے سب امور میں، حتیٰ کہ ان امور کی تفصیلات میں:

۱) یا تو صحابہ نے اتفاق کیا ہے اور وہاں ان سے اختلاف جائز نہیں خواہ وہ فقہی مسائل کی بابت کیوں نہ ہو......

۲) یا پھر ان امور میں صحابہ نے کہیں اختلاف کیا ہے (جو کہ فروع میں ہی کیا ہو سکتا ہے نہ کہ اصول میں) وہاں صحابہ کے اقوال (۱) میں سے قولِ راجح اختیار کیا جائے گا۔ (۲) یوں مجموعی طور پر اقوالِ صحابہ سے خروج پھر بھی نہ ہوگا۔......

۳) اور یا پھر صحابہ نے خاموشی اختیار کی ہے جس کی دو صورتیں ہیں: (الف) صحابہ کی خاموشی اگر عقائد اور "اصولِ دین" میں سے کسی امر کی بابت ہے مثلاً خدا کی صفات یا عقیدہ کی تفصیلات وغیرہ۔ تو صحابہ ہی کی طرح اس معاملہ پر خاموش رہنا اور اس کی ٹوہ میں جانے سے احتراز کئے رہنا بعد والوں پر لازم ہوگا (ب) اور اگر وہ مسئلہ فروعی اور فقہی ہے اور اس کا حل پیش کرنے کی کسی دور میں ضرورت پیش آ چکی ہے تو اس کا حل صحابہ ہی کے اصولِ استدلال اور انہی کے دیے ہوئے ضوابطِ قیاس و اجتہاد کو سامنے رکھ کر، وقت کے فقہاء اپنے دور کے اندر تلاش کریں گے۔ (۳)

ائمۂ اربعہ ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ و ابن حنبلؒ و دیگر ائمہ اہلسنت کے ہاں مختلف پیرایوں میں یہی بات دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی منہج پر (ان کے اساتذہ) تابعین نے صحابہؓ سے

(۱) گو عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک صحابہ کے اقوال میں عندالاختلاف کوئی سا بھی قول اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہی مذہب امام احمد بن حنبل کا ہے۔ مگر جمہور کے نزدیک صحابہ کے اقوال میں اختلاف ہو تو ان میں سے قول راجح اختیار کیا جائے گا نہ کہ کوئی سا بھی قول، یعنی دلیل کی بنیاد پر ایک قول کو چھوڑ بھی دیا جا سکتا ہے۔ (دیکھیے جامع بیان العلم وفضلہ ص ۳۶۶ تا ص ۳۷۱) کیونکہ اس طرف صحابہ کا قول ہے تو اس سے متعارض دوسری طرف بھی صحابہ ہی کا قول ہے۔

(۲) اس قول راجح کے اختیار میں اگر کوئی اختلاف ہو تو اس کو اختلاف سائغ کہا جائے گا۔ یعنی وہ اختلاف جس کیلئے دین میں گنجائش ہے اور جس کے باقی رہتے ہوئے بھی مسلمانوں کا اجتماع اور اخوت اور ان کے باہم مل کر جہاد کرنے اور اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کا عمل ذرہ بھر متاثر نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ فقہی امور میں اختلاف ہو جانے کے باوجود اگر صحابہ میں وحدت اور اخوت برقرار رہتی ہے تو اسی اختلاف کے رہتے ہوئے ہم میں اخوت اور وحدت کیوں باقی نہ رہنی چاہیے؟!

(۳) دین کے اس حصہ میں بھی اگر اختلاف ہو جاتا ہے یوں وقت کے اہل علم کا اپنے دور کے کسی معاملہ میں اجتہاد مختلف ہو جاتا ہے تو بھی اختلاف سائغ شمار ہوگا۔ اختلافِ سائغ، یعنی ایسا اختلاف ہو جانے پر ایک دوسرے کے سر آنا جائز نہیں۔

تربیت پائی اور پھر آگے (ان کو) تربیت دی تھی۔ اسی منہج پر صحابہؓ اپنے زیر تربیت تابعین کو مجموعی طور پر پاتے رہے تو اس پر اظہار اطمینان کرتے رہے تھے جبکہ اس منہج سے خروج کر لینے والوں کی مذمت میں صحابہ آخری حد تک چلے جاتے رہے اور ان کو اہل بدعت وتفرقہ قرار دیتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن عمرؓ نے قدریہ کے کچھ لوگوں کو، جو کہ قرآن سے استدلال کا اپنے تئیں خوب خوب اہتمام کرتے تھے، پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ پوری زمین کی دولت بھی راہِ خدا میں خرچ کر ڈالیں تو اس انحراف کے ہوتے ہوئے جس کو وہ لے کر چل رہے ہیں، یہ عمل ان کو کچھ فائدہ دینے والا نہیں۔ یہ واقعہ عقیدہ کی بیشتر کتب میں مذکور ہے۔

یوں صحابہؓ کے اس تعامل نے ہی سب سے پہلے ایک طرف "اہلِ سنت وجماعت" اور دوسری طرف "اہلِ بدعت وتفرقہ" کے مابین ایک واضح لکیر کھینچ دینے کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ہی "اجتہاد" اور "انحراف" کو ضبط میں لانے کی اساس فراہم کی اور "اِتّباع" اور "شقاق" میں تمیز کرائی۔ پس اس امر کی تاسیس خود صحابہؓ کے ہاتھوں ہوئی۔ اسی منہج پر تابعینؒ نے صحابہؓ سے تربیت پا کر پھر آگے اَتباعِ تابعینؒ کو تربیت دی۔ فقہاءِ اربعہ، اور کتبِ ستہ (جنکو صحاحِ ستہ کہا جاتا ہے) کے مصنفین سمیت بیشتر مشہور محدثین، فقہاء اور مؤلفین اسی اَتباعِ تابعین کے دور سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

اَتباعِ تابعین کا یہ وہ زمانہ ہے جب شریعت کے تقریباً سب علوم کی تدوین ہوئی۔ حدیث، تفسیر، فقہ، مغازی، اصول اعتقاد، ادب، اخلاق، موضوعاتِ ایمان، اصولِ لسان سب کچھ مدون ہوا اور بعد کی نسلوں کیلئے محفوظ کر دیا گیا۔ یہ خدا کی رحمت تھی کہ صحابہ کا وہ علم جو اطرافِ عالم میں پھیل چکا تھا اور، فتوحات اور نئی اقوام کی تربیت ایسی کچھ خاص ضروریات کے تحت، عالمِ اسلام کے سب ملکوں، شہروں اور بستیوں میں منتشر تھا ___ تابعین واتباع تابعین کی تابڑ توڑ علمی رحلتوں اور طویل مذاکروں اور شبانہ روز مراجعوں کے اس دیوانہ وار عمل کے نتیجے میں ___ صحابہ کا چھوڑا ہوا یہ علم اپنی تنقیح، چھان پھٹک اور اپنی نقل وروایت اور ذکر ومراجعہ اور شہرہ وتذکرہ میں جب اپنے عروج کو

پہنچ چکا اور اس کو جمع وحفظ اور تاصیل وتبویب کے جب بہترین امکانات اور تاریخ کے بہترین اور صالح ترین دماغ حاصل تھے اور اس کثرت سے اور اس وافر انداز میں میسر تھے تو دھڑا دھڑ اس کی تدوین ہوئی اور قیامت تک کی نسلوں کیلئے کمال دیانت اور خوبصورتی سے اس امانت کو محفوظ کرلیا گیا۔ جبکہ اس نسل کے گزرنے کے ساتھ ہی فتنوں اور گمراہیوں کا وہ طوفان آیا کہ اہلسنت کا وجود غیر معمولی حد تک سمٹ جانے اور معاشرے کی سطح پر پسپائی اختیار کر جانے پر مجبور ہوا۔ یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری کے اواخر میں اور چوتھی صدی ہجری تقریباً ساری ہمیں عالم اسلام پہ ہر طرف باطنی فرقوں، روافض، زنادقہ اور موقعہ پرستوں کی ہی ریاست اور سیادت نظر آتی ہے۔

اس انحطاط کا ذکر، جو تبع تابعین کا دور گزرنے کے ساتھ ہی عالمِ اسلام پر آیا اور سنت وبدعت کے خلط کی راہ ہموار کرنے لگا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بعض اہلسنت طبقے ہی جزوی طور پر بدعات کے حامل پائے جانے لگے، اور یوں یہاں سے سنت راستے کی تنقیح کے عمل نے ایک نیا موڑ دیکھا...... اس کا ذکر ہم آئندہ فصل میں کریں گے۔ البتہ ان تین زمانوں کے اندر دین کو اس کے مستند مصادر سے لینے اور مختلف حالات کے اندر اس کے اصولوں کی تطبیق کرنے اور پھر معاشرے کے اندر اس کو لے کر چلنے کا پورا ایک منہج سامنے آچکا تھا، نہ صرف سامنے آچکا تھا بلکہ ایک معلوم روشن شاہراہ کی صورت دھار گیا تھا یوں کہ جب اس سے انحراف ہو تو فورا معلوم اور محسوس ہونے لگے اور طبیعتیں صاف اس سے ابا کرنے لگیں۔ نہ صرف دین پر چلنے اور وحی سے ہر ہر معاملے میں راہنمائی لینے کا ایک منہج ان تین زمانوں کے اندر ایک کامل انداز میں سامنے آچکا تھا اور تنوعِ آراء کی حدود بھی اس کے اندر واضح ہو چکی تھیں اور وہ 'سرخ لکیر' بھی پوری طرح واضح ہوگئی تھی جس کو پار کرنا اختلاف کی وہ قسم کہلائے جو امت کے اندر نا قابلِ قبول اور نا قابلِ برداشت سمجھا جائے گا...... نہ صرف یہ، بلکہ دین سے انحرافات (بدعات) کی درجہ بندی کرنے حتیٰ کہ دین سے انحراف اور ابتداع کا مرتکب ہونے والوں کے ساتھ تعامل اختیار کرنے کی جو جو صورتیں اپنائی جانا

ہیں ان کو واضح کر دینے تک کا عمل پوری کامیابی کے ساتھ ہو گیا تھا۔

اب، یعنی تبع تابعین کا دور گزر جانے کے بعد، معاملہ اگر اسی زور اور قوت کے ساتھ نہ بھی جاری رہ سکا ___ اور واقعتاً تبع تابعین کے بعد عالم اسلام کے اطراف واکناف میں اہلِ سنت کا معاملہ اس زور وشور سے اور اس بڑی سطح پر اور اس عوامی پزیرائی کے ساتھ جاری نہ رہا ___ تو بھی بہر حال اس بات کا خدشہ نہ رہا تھا کہ اس راستے کا سِرا ہی روپوش ہو جائے گا۔ ذرہ بھر کوشش کر کے معاملے کا سرا پا لینا ہر شخص کیلئے ممکن تھا اور آج تک ہے۔

یہ وہ کام تھا جو اسلام کے تین ابتدائی زمانوں میں، کہ جس کی بابت ہم ہر خطبے میں سنتے ہیں: **خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم**......

یہ وہ کام تھا جو اسلام کے تین ابتدائی زمانوں میں، کہ جن کو ''قرونِ سلف'' بھی کہا جاتا ہے، ''قرونِ خیِّرہ'' بھی، ''قرونِ نیِّرہ'' بھی اور ''قرونِ ثلاثہ'' بھی، بصورتِ اتم تکمیل پا چکا تھا......

'بعد والوں' کو اب انہی کے پیچھے کھڑے ہونا ہے، ورنہ اِن کی جہت آپ سے آپ ''انحراف'' مانی جائے گی اور صریحاً ''شقاق''۔

'جہت' کے تعین کے معاملہ میں اسلام کی پہلی تین نسلوں کے اس برگزیدہ عمل نے، جو کہ ڈھائی تین صدیوں پر محیط ہے، مسئلہ کو اتنا ہی سادہ اور آسان کر دیا ہے۔



تقسیم عام کیلئے، یہ مضمون علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں، سستی چھپائی کے ساتھ، دستیاب ہے

منہجِ سلف
قرونِ ثلاثہ کے بعد

اَتباعِ تابعین کا دور گزرتے ہی یہاں ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا دیکھنے میں آیا جو کہ تیسری صدی کے اواخر میں اٹھنا شروع ہوا اور چوتھی صدی کے نصف کو پہنچتے پہنچتے ___ یعنی ایک صدی کے دوران ہی ___ تقریباً پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ یہ بنیادی طور پر ایک باطنی اور رافضی انقلاب تھا جو مسلم دُنیا کے ہر طرف اندھیرا کر چکا تھا۔ چوتھی صدی کے نصف کے آس پاس پر ذرا ایک نگال ڈالیئے اور دیکھئے عالم اسلام کی حالت کیا تھی:

۱) جزیرۂ عرب کے بیشتر خطوں میں بحرین کے قرامطہ کا دور اقتدار جو کہ رافضی باطنیت کا بدترین نمونہ تھے اور جو کہ کعبہ سے حجر اسود تک اکھاڑ لے گئے تھے اور اہلسنت کا قتل عام کرتے تھے۔

۲) مراکش سے لے کر مصر تک کے طویل وعریض خطہ پر بلکہ شام کے بعض علاقوں تک پر فاطمی (دراصل عبیدی) خلافت جو کہ باطنی رافضیت کی ایک خبیث شکل تھی اور جس کی ایک فرع آج کے اسماعیلی ہیں۔اسی 'فاطمی خلافت' کا اقتدار بعدازاں پانچویں صدی میں صلیحیوں کے ہاتھوں یمن تک میں قائم ہوا بلکہ کوئی ایک سال بھر کیلئے بغداد کے اندر بھی قائم رہا اور ایک معجزانہ طور پر بغداد کی برائے نام سنی خلافت اس کے ہاتھوں مکمل طور پر ختم ہو جانے سے بچ پائی۔

۳) عراق سے لے کر فارس، اصفہان، طبرستان اور جرجان تک بویہی اقتدار جو رافضی عقائد کا پورے دھڑلے کے ساتھ پرچار کرتا تھا اور جس نے کہ دارِخلافت بغداد پر قابض ہو کر مساجد کے دروازوں تک پر اصحاب رسولؐ کو گالیاں لکھ رکھی تھیں۔

۴) شمالی عراق اور جنوبِ شام پر بنوحمدان کا اقتدار جو ان سب میں نسبتاً بہتر تھے اور جو کہ ان سب میں وہ تنہا ریاست تھی جو عرصہ تک روم کے ساتھ برسرِقتال بھی رہی۔ گویہ رافضی نہ تھی مگر واضح طور پر تشیع کا میلان رکھتی تھی۔ تشیع تو گویا وقت کا فیشن بن چکا تھا۔

۵) ملتان جو کہ ہند کے مفتوحہ خطوں میں مرکز کی حیثیت رکھتا تھا میں اسماعیلی رافضیوں کی سلطنت جو بعدازاں چوتھی صدی کے اختتام پر محمود غزنویؒ کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی۔

پورے عالم اسلام میں صرف دو خطے بچتے تھے جو رافضی یا شیعی اقتدار کے زیرِتسلط آنے سے محفوظ رہے گو وہاں بھی بے شمار بدعات اور انحرافات عام ہو رہے تھے۔ ایک طرف عالم اسلام کے آخری مشرقی کونے میں ماوراء النہر کی سامانی ریاست اور دوسری جانب آخری مغربی کونے پر اندلس کی اموی امارت جو کہ خود بھی حالات کے ہاتھوں ڈھچکولے کھا رہی تھی بلکہ فاطمیوں کے توسیع پسندانہ عزائم اور جارحانہ حملوں سے بڑی مشکل کے ساتھ اپنا دفاع کر رہی تھی۔

اس لحاظ سے چوتھی صدی ہجری ہمیں رافضی اور باطنی ظلمت کی صدی نظر آتی ہے۔ اسی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر صلیبی شام اور فلسطین کے ساحل پر آ بیٹھے اور بالآخر بیت المقدس پر بھی قابض ہوئے۔ جبکہ اسی صدی کے اواخر میں جا کر ہم دیکھتے ہیں کہ اہلسنت ایک نئی کروٹ لیتے ہیں اور پانچویں صدی میں ایک نئے سرے سے سنت اور توحید کا غلغلہ ہونے لگتا ہے۔

یوں پانچویں اور پھر چھٹی صدی ہمیں رافضیت کے خلاف اہلسنت کی فتح کی صدی نظر آتی ہے جس میں گواس بار بہت کچھ 'دخن'[۱] بھی تھا۔ سیاسی اسٹیج پر اس عمل کا آغاز چوتھی صدی کے اواخر میں غزنوی فتوحات سے ہوا جن کی تگ وتاز بغداد سے لے کر ماوراء النہر اور بلاد ہند تک تھی اور جس کے دوران ___ جیسا کہ امام ابن کثیرؒ البدایہ[۲] والنہایۃ میں بیان کرتے ہیں ___ اہل بدعت پر زمین تنگ ہوگئی تھی۔ پھر پانچویں صدی کے ربع دوئم میں بنی سلجوق کی دولت قائم ہوئی جو کہ عمومی طور پر سنت اور شرع کے متبع تھے جن کا کہ اقتدار ماوراء النہر سے لے کر خراسان تک اور پھر رافضی بویہیون کا اقتدار ختم کر دینے کے بعد عراق اور جنوب شام تک جا پہنچا۔ حتی کہ سلجوقیوں نے روم سے جہاد کا ازسرنو آغاز کیا اور ایشیائے کوچک میں عرصہ کے بعد نئی فتوحات ہوئیں۔ اس کے بعد پھر زنگی دولت نے چھٹی صدی ہجری کے ربع دوئم میں شام کو اہلسنت کا قلعہ بنا دیا جس کے بعد ایوبی دولت نے مصر سے فاطمی خلافت کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر کے شام اور مصر کو سنت کے پرچم تلے جمع کیا۔ تب اس سُنی وحدت کے نتیجہ میں چھٹی صدی کے نصف دوئم میں بیت المقدس اہل اسلام کو واپس ملا۔

نورالدین محمود زنگی اور صلاح الدین یوسف ایوبی وغیرہ کا امام ابن تیمیہ اپنی کتب میں ''ملوک السنۃ'' کے لقب سے ذکر کرتے ہیں۔ (دیکھیئے فتاوی ابن تیمیہ ج ۷ اص ۵، ج ۲۷ص ۴۹، ج ۳ص ۲۸۰)



اتباع تابعین کا زمانہ گزرنے کے بعد، جب معاملہ ایک بڑی سطح پر اس قدر متاثر ہو چکا تھا، اور منہجِ سنت تک رسائی اتنی ہی آسان نہ رہی تھی جتنی کہ قرونِ ثلاثہ خیرہ میں، تو اس معاملہ کی اب ایک اور جہت بنی......

(۱) غبار و آلودگی۔ یعنی مجموعی طور پر معاملہ اہلسنت راہ پر تھا مگر بدعت کا ایک گونہ خلط ساتھ تھا، جس سے کہ یہ لوگ اہلسنت سے خارج بہر حال نہ ہوتے تھے۔

(۲) البدایہ والنہایہ: جلد: ۱۱ صفحہ: ۲۲۲۔۲۲۷

اہلسنت (جماعتِ سلف کی راہ پر چلتے آنے والے اصحاب) معاشرے میں اب وہ حیثیت نہ رکھتے تھے جو کہ گزشتہ ادوار میں ان کو حاصل رہی تھی۔ معاشرہ اب ان سے اس طرح رہنمائی نہ لے رہا تھا اور نہ لے سکتا تھا جس طرح کہ اس سے پہلے۔ وقت کے علمی، فکری اور معاشرتی رجحانات پر اب یہ اس طرح چھائے ہوئے نہ تھے اور نہ ہی فکری اور تہذیبی حالات پر ان کی وہ گرفت رہی تھی۔ باطنی اور رافضی اور معتزلی غلبہ کے پیش نظر اہل سنت اب اُس پہلے والے انداز میں معاشروں کی قیادت کر ہی نہ کر سکتے تھے۔

پس اب ایک بڑے خلا کا پیدا ہونا یقینی تھا۔

خالص علم کی پسپائی، علماء کا ایک بڑی تعداد میں اٹھ جانا۔ علمی حلقوں کی رونقیں بڑی حد تک قصۂ پارینہ بن جانا اور زنادقہ و اہل بدعت کا راج...... اب یہ وہ دور تھا جس میں سنت اور بدعت خلط ہونے لگے۔ جبکہ اس سے پہلے اس بات کی گنجائش نہ تھی۔ رفتہ رفتہ اہلسنت ایک نام بن کر رہ گیا جبکہ اس سے پہلے یہ ایک حقیقت تھی نہ کہ محض ایک نام۔ بہت سوں کیلئے اب یہ ایک نسلی تسلسل تھا اور کچھ لگے بندھے کام کر لینے اور کچھ ظاہری علامات اختیار کر لینے کا نام۔[۱]

حتی کہ وہ لوگ بھی جن کیلئے یہ ایک نام نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی، ان میں سے بھی بہت سے ایسے تھے جن کیلئے یہ حقیقت اب دن بدن 'جزوی' ہوتی جا رہی تھی۔ اہلسنت کے بعض اصول سے ان کا شدید تمسک تھا جبکہ اہلسنت کے بعض اصول پر ان کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ فکر و فہم کے جن خطوں پر سنت کی پسپائی ہو رہی تھی وہ بدعت کے زیر آب آ رہے تھے۔ چنانچہ اسی بات کو ہم نے سنت اور بدعت کا خلط کہا ہے۔ سو ایک کثیر تعداد اب ایسے لوگوں کی ہونے لگی جو جزوی طور پہ

---

(۱) حتی کہ بعض کیلئے یہ ایک 'عصبیت' کی شکل بھی اختیار کر گیا جس کے مظاہر آپ آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔

سنت افکار پر تھے اور جزوی طور پر بدعت افکار پر۔ (۱) جبکہ شمار بدستور یہ سب لوگ اہلسنت ہی ہوتے رہے۔

یوں بہت سے لوگ جو اہلسنت شمار ہوتے تھے ان کے حق میں اب یہ دیکھا جانا ٹھہر گیا تھا کہ کوئی اہلسنت ہے تو اسکے ہاں منہجِ اہلسنت درحقیقت کس قدر پایا جاتا ہے۔ یعنی معاملہ 'فیصدی' کا ہو گیا تھا۔ اور بہت سے لوگوں کے بارے میں یہ بات صادق آتی تھی۔

سنت اور بدعت کے خلط کا یہ وہ دور ہے جس میں کئی ایک اہلسنت طبقوں میں نئے رجحانات نے جنم لیا اور یہ رجحانات آگے چل کر خود بھی رفتہ رفتہ بدعت کی صورت دھارتے گئے گو بالکل آغاز کے اندر ایسا نہ تھا۔ تب سے اب تک اہلسنت کے کئی ایک طبقوں کی ان رجحانات سے جان نہیں چھوٹی۔ صوفیت کے بہت سے سلسلے، عقائد میں اشاعرہ اور ماتریدیہ وغیرہ کا پھیل جانا اور وقت کا ایک فیشن بن جانا سب اسی دور کی یادگار ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ گو بدعت کے بعض پہلوؤں کا سدباب کر رہے تھے مگر دوسری جانب منہج سلف کے بعض پہلوؤں سے خود بھی بیگانہ ہو رہے تھے۔ (۲)

مذہبی تعصب بھی اسی دور کی یادگار ہے۔

مذاہبِ اربعہ و دیگر فقہی مذاہب درحقیقت اہلسنت کے معتبر فقہی مذاہب ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا اہلسنت ہی کا فقہی تسلسل بن کر رہنا ہے۔ ''اصول دِین'' کے اندر ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ کوئی اختلاف ہے تو فروع کے اندر جس کی کہ سلف کے ہاں گنجائش رہی ہے۔ چنانچہ فروع کے اندر فقہی مذاہب کا یہ تنوع،

---

(۱) اہلسنت کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک ہی شخص میں سنت اور بدعت دونوں وصف مجتمع ہوں اور وہ اپنی سنت کے بقدر قابل ستائش ہو اور اپنی بدعت کے بقدر قابل گرفت یا- خاص حالات میں- قابل عذر (دیکھیے فتاوی ابن تیمیہ ج ۲۸، ص ۲۰۹)

(۲) اس تاریخی اور واقعاتی مسئلہ کو وضاحت سے پڑھنے کیلئے دیکھیئے: مجموع فتاوی ابن تیمیہ (جلد: ۳، صفحہ: ۳۴۸)

منہجِ سلف کا ہی دراصل ایک تسلسل تھا۔ ان کے اپنائے جانے میں ___ جب تک کہ معاملہ اندھی تقلید اور ضد بازی تک نہ پہنچے ___ کوئی بھی ہرج کی بات نہ تھی۔ امام طحاوی (۲۳۹ھ......۳۲۲ھ) ایسے ائمہ سنت اور ترجمانِ عقیدۂ سلف کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فروع میں خود حنفی مذہب رکھتے ہیں البتہ کسی کو اس کے فقہی مذہب سے برگشتہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں پاتے۔ یعنی خود ایک فقہی مذہب پر رہتے ہیں تو دوسروں کو اپنے اپنے فقہی مذاہب پر رہنے دیتے ہیں۔ البتہ ''اصولِ دین'' میں وہ پوری اُمت کو سلف کے اس منہج پر لاتے ہیں جس کی اِتباع حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، اہل الحدیث، اہل الظاہر وغیرہ سمیت سب پر یکساں لازم ہے۔ یہی طریقہ اصولِ اہلسنت کی تعلیم دینے والے سب ائمہ کا رہا اور صدیوں چلتا رہا۔ فروع کو میدانِ کارزار کسی نے بھی نہ بنایا۔ لوگوں کے فقہی مذاہب چھڑوانے یا بدلوانے کی تحریک کبھی نہیں چلائی گئی۔ صرف تعصب اور تقدیسِ رجال سے ممانعت کی گئی۔ یہی طریقہ ہمیں آجری (م۳۶۰ھ) ابن بطہ (م۳۸۷ھ) ابن مندہ (م۳۹۵ھ) اور لالکائی (م۴۱۸ھ) وغیرہ کا دکھائی دیتا ہے جو اپنے دور کے ائمہ سنت تھے اور اصول اہلسنت کے بہترین ترجمان۔ بلکہ آج تک اصولِ اہلسنت کا علم پانے کیلئے انہی کے مؤلفات سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اور یہی اسلوب پھر ہمیں بعد ازاں ابن تیمیہ، ابن قیم، نووی، ذہبی اور ابن حجر وغیرہ کے ہاں ملتا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے دور میں سنت کے امام تھے۔ فروع کے اندر بحث وتحقیق میں بھی گو انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر مذاہب کی جنگ بھی نہیں کروائی۔ البتہ اصولِ دین میں نزاع اور افتراق کی شدید سرکوبی کی اور اس پہلو سے اُمت کو پہلے والے راستے پر لے آنے اور قائم رکھنے کیلئے ہی سرگرم رہے۔ اُمت کی تالیف اور شیرازہ بندی کی ان کے ہاں یہی اساس تھی۔

چنانچہ فروع کے اندر فقہی مذاہب کا تنوع پایا جانا حرج کی بات تھی اور نہ اب ہے۔ مگر چوتھی صدی ہجری میں جو فرق آیا وہ مذہبی تعصب کی بدعت تھی۔ اس کے باعث فروع ہی لوگوں کیلئے اصول بن گئے۔ اب لازماً یہ ہونا تھا کہ اصول سرے سے ہی ان کی

نگاہ سے روپوش ہو جائیں۔ سو سب معرکے اب اسی میدان میں سر ہونے لگے۔ یہاں تک کہ فقہی مذاہب بہت سوں کیلئے قریب قریب 'ادیان' کی شکل اختیار کر گئے۔

بہر حال اسلام کی پہلی تین نسلیں گزر جانے کے بعد معاً جو دور آیا اور حالات نے جس انداز سے پلٹا کھایا (سیاسی پلٹا تو صحابہ کے دورِ آخر میں ہی آ گیا تھا مگر ہم ایک فکری اور نظریاتی پلٹے کی بات کر رہے ہیں) اس کے بعد اہلسنت سے منسوب کئی ایک طوائف میں کچھ ایسے غیر مطلوبہ رجحانات در آنے لگے اور اس کے باعث ان کے ہاں فکر وعمل کی کچھ ایسی سکہ بند جہتیں بنیں کہ اہلسنت سے منسوب ایک کثیر تعداد آج تک ان رجحانات کے زیر اثر ہے۔ خصوصاً برصغیر۔ ان تمام تر صدیوں میں اصلاح کی کوششیں بھی گو کم نہ رہیں پھر بھی اہلسنت کا داخلی میدان مکمل طور پر صاف نہ ہو سکا۔ تا آنکہ زوال کی یہ آخری صدیاں آئیں اور بہت کچھ اپنے ساتھ بہا لے گئیں۔ یوں اصلاح اور تبدیلی اور دِین کو خالص کرنے کا عمل اور بھی بہت پیچھے چلا گیا۔

تیسری صدی ہجری کے بعد سے لے کر یوں بھی ائمۂ اہلسنت پر کوئی وقت ایسا نہیں آیا جو شدید طور پر ہنگامی دور نہ ہو۔ بہر حال اہلسنت کی یہ جزوی پسپائی جو چوتھی صدی کے اندر دیکھنے میں آئی اور ایک ایسے عظیم الشان تسلسل کے فوراً بعد آئی ...... یہ ایک ایسا دھچکہ تھا جس سے آج تک اہلسنت کا وجود سنبھلنے نہیں پایا۔

□□□□□□

اب جب یہ دیکھنے کا وقت آ گیا تھا کہ کوئی آدمی 'کتنے فیصد' اہلسنت منہج پر ہے تو طبعی اور ضروری امر تھا کہ اصولِ اہلسنت اور منہجِ سلف کی اب ایک از سر نو تنقیح بھی ہونے لگتی۔ 'اہلسنت' جب ایک نسلی اور گروہی پہچان بن گئی تھی تو اصل حقیقت کو جلی کیا جانا طبعی طور پر وقت کی ایک بڑی ضرورت تھی۔ سنت اور بدعت کا جہاں خلط ہو قدرتی طور پر وہاں یہ امتیاز کرایا جانا تھا کہ کونسی چیز ''شروع سلف'' سے چلی آ رہی ہے اور کونسی چیز 'بعد میں' کہیں سے آ شامل ہوئی ہے۔

پیش ازاں، قرون ثلاثہ کے دوران، اصول اہلسنت سے تمسک ایک بے انتہاء معلوم حقیقت اور ایک حد درجہ متعین امر سے چمٹ جانے کا نام تھا۔ مگر اب جو اس معاملہ کی نئی جہت بنی وہ یہ کہ 'اصول اہلسنت سے تمسک' کے معنی میں 'چمٹ جانے' کے علاوہ 'تنقیح کر لینے' کا مفہوم بھی اس میں شامل ہو گیا۔

پس اب اس بات کا تقاضا تھا کہ اس دور میں اصولِ اہلسنت کے نہایت ثقہ قسم کے ترجمان پائے جائیں۔ چنانچہ وقت کے بہت سے اچھے اچھے مجاہدانہ کردار کے مالک علماء نے اپنے دور کے حوالے سے اصولِ اہلسنت کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیا۔ کچھ اہل علم تھے جنہوں نے کچھ خاص متعین میدانوں میں اصولِ سنت اور منہجِ سلف کی ترجمانی کی جبکہ راہِ سلف کے کچھ خاص شہسواروں نے منہجِ سلف کی ایک جامع انداز کی ترجمانی کا فرض بھی نبھایا۔ چنانچہ ان متاخر صدیوں میں کچھ خاص چہرے اصولِ سنت اور منہجِ سلف کی شناخت بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

'آپریشن' تکلیف کے بغیر کب انجام پاتا ہے۔ اس عمل میں اب یہ بھی لازمی تھا کہ اہلسنت سے تاریخی طور پر منسوب طبقے آپس میں بھی الجھنے لگیں اور خود انہی کے بہت سے طبقے اس ''تحقیق'' اور ''تنقیح'' اور ''احیاء وتجدید'' کے عمل کو خوش آمدید کہنا اپنے لئے دشوار پائیں بلکہ بسا اوقات اس کو بُرا بھلا تک کہیں اور حتی کہ اس کو 'اہلسنت' ہی سے انحراف قرار دیں!

منہجِ سلف کے اصل ترجمانوں اور اپنے وقت میں تجدیدی مساعی کرنے والوں کیلئے چنانچہ اب یہ ایک چومکھی تھی کہ اپنوں کو بھی گھر لانے کی سعی کریں اور پرایوں سے بھی اس گھر کا تحفظ کریں۔

تب سے اب تک یہ معاملہ مختلف انداز میں اور مختلف سطحوں پر چلتا رہا ہے۔ اس میں اب ایک فرق پچھلے دو سو سال سے یہ آیا ہے کہ مغربی اقوام اور مغربی افکار کے پوری دُنیا پر غلبہ پا لینے کے باعث زمانہ بڑی حد تک ایک بالکل ہی نیا رخ اختیار کر گیا ہے

اور یکا یک اب یہ ضرورت آن پڑی ہے کہ وہ اصولِ اہلسنت جن کی ترجمانی یہاں کے آج سے دوسو سال پہلے کے روایتی معاشروں کے اندر ایک خاص انداز کے ساتھ کی جاتی رہی اور کسی نہ کسی حدتک کامیابی کے ساتھ کی جاتی رہی اور جو کہ یہاں کے روایتی مسائل یا روایتی بدعات یا روایتی انحرافات کے مدمقابل کی جاتی رہی اور جس کے دوران سنت اور بدعت کے ایک روایتی خلط کی تنقیح ہوتی رہی ...... انہی اصولِ سنت کی ترجمانی اب آج کے اِن غیر روایتی معاشروں میں کر کے دکھائی جائے اور آج کے ان 'غیر روایتی مسائل' اور 'غیر روایتی بدعات' اور 'غیر روایتی انحرافات' کے مدمقابل سلف کے اس منہج کو لایا جائے اور سنت اور بدعت کے اس 'غیر روایتی' خلط کی بھی اسی منہج کی بنیاد پر ایک تنقیح کی جائے۔ یہ بہرحال کوئی چھوٹی تبدیلی بھی نہیں ہے۔ بہت سے اہل علم حضرات جو یہاں کے 'روایتی معاشروں' میں منہج سلف کی ایک اچھی ترجمانی کر سکتے تھے آج کے ان 'غیر روایتی' معاشروں میں تقریباً تقریباً کچھ بھی پیش کر سکنے سے اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں بلکہ سچ پوچھیں تو ہکا بکا دیکھے جاتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ.

اس لحاظ سے اب ہم جہاں کھڑے ہیں وہ تاریخ کا ایک پیچیدہ مقام ہے۔ اہلسنت کی اس بار کی پسپائی ہرگز کوئی چھوٹی پسپائی نہیں۔

□□□□□□

تقسیم عام کیلئے، یہ مضمون علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں، سستی چھپائی کے ساتھ، دستیاب ہے

تنقیح 'بعد والوں' کے مناہج کی
نہ کہ ''دورِ اول'' کے مسلمات کی!

جس ''تنقیح'' یا ''تحقیق'' کی ضرورت کا پچھلی فصل میں ذکر ہوا ہے ور جس کی کہ، پچھلی بارہ صدیوں سے، ہر دور میں ہی ضرورت رہی ہے، خصوصا برصغیر کی فکری اور عقائدی صورتحال تو شدت سے اس کی ضرورت مند ہے...... اس سے بھی ہماری مراد واضح ہو جانی چاہیے۔

بصورت دیگر 'تحقیق' اور 'تنقیح' کے اس نعرے کا سارا فائدہ یہاں کے وہ طبقے اٹھا لے جائیں گے، بلکہ اٹھا لے گئے ہیں، جو کہ ویسے ہی اس باب میں اپنی ایک مار پر ہیں اور جو کہ اس امت کے فکر و فہم کو اس پٹڑی سے ہی اتار دینے کے درپے ہیں جس پر یہ قرون ثلاثہ میں کامیابی کے ساتھ چلتی رہی ہے، اور اس کی بجائے یہ آج اس امت کو اپنی پیچیدہ راہوں پر چلا دینے کے خواہشمند ہیں۔

اس 'تحقیق' سے مراد 'پہیے کی از سر نو ایجاد' نہیں جیسا کہ اسلام کی 'از سر نو تعبیر' کرنے کے خواہاں بہت سے حضرات آج سمجھ رہے ہیں اور جس کے باعث 'تنقیح'، 'تحقیق'، اور 'چھان پھٹک' ایسے الفاظ سن کر یہ باغ باغ ہونے لگتے ہیں!

قرآن حدیث کو خود اپنی محنت اور ذہانت سے، یا زیادہ سے زیادہ عربی سے مدد لے کر، سمجھ لینے کی کوشش وہ 'تحقیق' نہیں جس کی آج یہاں بالفعل ضرورت ہے اور جو کہ ہر دور میں رہی ہے۔ کتاب وسنت کو سمجھنے کے معاملہ میں محض اپنے زور بازو پر

انحصار کرنا یا زیادہ سے زیادہ پچھلے کسی سو پچاس سالہ 'مکتبِ فکر' کا التزام کرنا اور اسی کا تسلسل بن کر رہنا بدعت اور انحراف کی جانب انسان کا پہلا قدم ہوسکتا ہے۔ سلف کے راستے کی پابندی کئے بغیر کتاب وسنت کے فہم کا کوئی طریقہ نہیں۔

وہ 'تنقیح' یا 'تحقیق' جس کی ضرورت خاص خیر القرون کے گزر جانے کے بعد پڑی اور اب تک باقی ہے اور ہمیشہ رہے گی وہ یہ کہ دین یا کتاب وسنت کے فہم کے حوالہ سے بعد والوں کے ہاں جو کچھ پایا گیا اس کو سلف کے منہج پر پیش کیا جائے اور انہی کے اصول اور انہی کے فہم کی بنیاد پر اس کا محاکمہ کیا جائے۔ اس تنقیح کا مطلب ہے کہ زمانۂ سلف کے بعد اہلسنت راستے میں یہاں جو ناروا اضافے ہوئے اور کچھ سنی طبقوں کے ہاں غلطی سے رواج پا گئے ان اضافوں کو اصول اہلسنت سے بے دخل کیا جائے۔ منہج سلف کے جن پہلوؤں کا دامن کچھ سنی طبقوں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا رہا ان کا ازسرنو احیاء کیا جائے۔ ایک 'نسلی تسلسل' بن جانے کے زیر اثر منہجِ اہلسنت میں یہاں اگر کہیں کوئی تبدیلیاں یا افراط وتفریط یا غیر مطلوبہ رجحانات آئیں تو ان کا خاتمہ کیا جائے۔

اس 'تنقیح' کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خود اس ''منہجِ سلف'' ہی کا محاکمہ شروع کردیا جائے! جیسا کہ بعض لوگ یہ خیال کر بیٹھے ہیں کہ قدیم سے چلی آنے والی ہر بات کی ہی آج چھان بین ہونی چاہیے! جس کے نتیجے میں ظاہر ہے کہ شرعی مصادر سے استنباط واستدلال کرنے کے مناہج ہزاروں کے حساب سے خود بخود میسر ہوں گے، جو کہ ان کے خیال میں زمانے کی مشکلات آسان کردے گا! جب سلف کو محاکمہ سے معاف نہ رکھا جانے کے منہج پر اتفاق ہو جائے گا تو پھر ہر شخص کا ہی محاکمہ ہوگا دلچسپ بات یہ کہ کسی ٹھوس بنیاد کے بغیر ہوگا اور یوں اب ہر شخص دوسرے کے استدلالات کی چھان بین کیا کرے گا؟ گویا اُمت کے کرنے کو پھر یہی کام رہ جائے گا۔ ایسی صدائیں جو 'تحقیق' اور 'تدقیق' وغیرہ کے نام پر اُمت کو اس مشن پر چلانے

کیلئے اٹھائی جا رہی ہیں وہ دراصل پوری اُمت کو 'فلسفی' بنا دینے کی ایک کوشش ہیں اور دراصل یہ اس اُمت کو انتشار کے ایک اتھاہ سمندر یا افتراق کے ایک لق و دق صحرا میں چھوڑ آنے کی ایک نادانستہ کوشش ہے جہاں سب سمتیں ایک ہو جائیں اور فہم شریعت کی بابت 'حوالہ کا کوئی ایسا نقطہ' reffering point ہی باقی نہ رہے جہاں سے باقی سب سمتوں کا تعین ہو جایا کرے۔ آج کی یہ جدت پسند 'تحقیقاتی' روش دراصل اس مفروضہ پر قائم ہے کہ اس اُمت کو ساری عمر سیمیناروں میں ہی رہنا ہے اور کلامی انداز کی بحثیں ہی کرتے رہنا ہے اور یہ کہ ایک کے بعد ایک مفکر کو ہی یہاں سنتے اور داد دیتے چلے جانا ہے اور اسی شغل میں صدیاں پار کر دینا ہیں جبکہ اپنے معاشرے اور اپنے زمانے میں اس اُمت کو اب اور کچھ نہیں کرنا!

یہ دراصل ایک فکری طوائف الملو کی ہے۔

جہاد کرنے والی اُمت کو جو پورے کرۂ ارض پر صفیں باندھ کر کھڑا ہونے اور قدم سے قدم ملا کر شرق تا غرب چلنے پر یقین رکھتی ہو، اپنے زمانے میں آگے بڑھنے کیلئے کوئی ٹھوس بنیاد چاہیے اور اپنے قدم دھرنے کو ایک پختہ زمین۔ ایک ایسی پختہ زمین جس کے ہر ہر قدم پر 'بحث' کرنا ضروری نہ ہو اور جس پہ ہزاروں لاکھوں لوگ پورے اعتماد سے پیر دھر لیں اور نسلوں کی نسلیں مطمئن ہو کر اس پر سے گزر جائیں اور جس کے بعض خطوں پر پیر دھرتے ہوئے اگر کسی غلطی کا امکان ہو بھی تو زیادہ سے زیادہ وہ اجتہادی خطا ہو۔

ہمارے آج کے بعض 'محققین' ہمیں تاثر دیتے ہیں کہ ایسی کوئی زمین اس اُمت کو میراث میں نہیں ملی۔ پس ہمارے یہ محققین ہی اُمت کی اس ضرورت کو اب پورا کریں تو کریں۔ پس اُمت اگر چاہے تو کتاب وسنت سے انہی کے بلکہ ان میں سے کسی ایک کے یا اس کے چند استادوں کے اخذ کردہ فہم، انہی کے استنباط کردہ اصول ومسلمات اور انہی کے تجویز کردہ راستہ کو اختیار کرے۔ جبکہ عملاً صورتحال یہ ہے کہ آج

کے ان 'تحقیقی' رجحانات میں ایک اصولِ استدلال کی بابت ہی اتنی متضاد جہتیں پائی جاتی ہیں کہ ان میں اگر فیصلہ کرنا ہو تو پوری کی پوری اُمت ان کے اختلاف میں ہی کہیں گم ہو کر رہ جائے۔

سو ان لوگوں کے پاس تو خود اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کیلئے کوئی بنیاد نہیں۔ ان میں سے ہر کوئی دوسرے کو غلط کہنے کیلئے کتاب وسنت کا ہی تو حوالہ دیتا ہے۔ کتاب وسنت بلاشبہ کسوٹی ہے۔ مگر کتاب وسنت کی کسوٹی، کیا اِن کے فہم کے ساتھ یا سلف کے فہم کے ساتھ؟ فہم تو بہر حال ضروری ہے خواہ ان کا ہو یا سلف کا۔ پس سوال ہے تو وہ یہ کہ "کس کا فہم"؟؟؟

کتاب وسنت کی جانب رجوع، اہلسنت کا اصلِ اول ہے۔ 'فہم سلف' معاذ اللہ 'کتاب وسنت' کے کسی متبادل کا نام نہیں۔ جیسا کہ بعض متعصب لوگ اپنے کسی امام کی بات کو نصوصِ شریعت پر ترجیح دے کر کرتے ہیں۔ اصل سوال صرف یہ ہے کہ کتاب وسنت کی جانب رجوع کس کے فہم اور کس کے اصولِ استدلال اور کس کے طریقے پر ہو، ان کے یا سلف کے؟

سلف کے راستے کی صورت میں دراصل ہمیں بہت سی غیر ضروری محنت اور تردد سے کفایت کر دی گئی ہے۔ فہمِ سلف کی صورت میں ہمیں جو چیز حاصل ہے وہ حق بھی ہے اور شریعت کے معانی کے تعین کی ایک ایسی بنیاد بھی کہ جس پر قوموں اور معاشروں کی ایک دوررس اور طویل المیعاد تعمیر ہو سکے۔ اس کے علاوہ آپ کو اور کیا چاہیے؟ اصول اور مسلمات جو قوموں کی ایک بنیادی ضرورت ہوا کرتے ہیں کہ جن پر آپ پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ لیں اور جن پر چلتے ہوئے قدم قدم پر پیچھے مڑ کر دیکھنا اور فکر میں پڑ جانا اور فلسفیانہ بحثیں کرنا آپ کیلئے ضروری نہ ہو، آپ کی بنیادی ضرورت ہے۔ سلف کا چلا ہوا راستہ آپ کے اسی درد کا مداوا تو ہے۔ پھر دوسری بات یہ ضروری ہے کہ آپ کے وہ مسلمات جن پر آپ اپنے دور اور معاشرے میں فکر وعمل کی

ایک بلند و بالا عمارت اٹھانا چاہتے ہیں، عین حق اور درست ہوں اور ان کے درست ہونے پر مطمئن رہنے کی آپ کے پاس کوئی ٹھوس بنیاد ہو۔ سلف کا راستہ آپ کے اس دُکھ کا علاج بھی ہے۔ اس کے علاوہ اور آپ کو کیا چاہیے؟ محض چلنا رہ جاتا ہے اور وہ ظاہر ہے کہ آپ کو خود ہی چلنا ہے۔

کتنا فرق ہے ایک ایسی قوم میں جس کو راستے کی نشاندہی ہو اور اس کے درست ہونے کی ضمانت بھی اس کو حاصل ہو اور اس کا محض اس پر چلنے کا سوال باقی ہو اور ایک ایسی قوم میں جس کا چلنا تو ابھی باقی ہو ہی، راستہ ڈھونڈنا بھی ابھی باقی ہو بلکہ راستہ کے ایک ایک قدم کی بابت طویل بحثیں کرنا بھی۔

حضرات! اصولِ اہلسنت کی تعلیم پر آپ کا کچھ وقت ضرور صرف ہوگا مگر یہ برصغیر میں آپ کے ایک بڑے معضلہ کا حل اور ایک دیرینہ مرض بلکہ ایک جان لیوا عارضہ کا جذری علاج ہوگا۔ یا یوں کہیے یہ آپ کی ایک ایسی طویل المیعاد سرمایہ کاری long term investment یا ایک کثیر المقصد multipurpose انفراسٹرکچر infra structure کی تعمیر ہوگی جو آپ کو نسلوں آرام دے۔

□□□□□□

پس وہ تمام مناہج اور وہ تمام رجحانات جو قرونِ سلف کے بعد سامنے آئے ہیں، بے شک وہ اہلسنت کے عنوان کے تحت ہی کیوں نہ ہوں، لازماً ایک تنقیح کے عمل سے گزارے جائیں گے۔ ان میں جو خیر ہے وہ قبول کی جائے گی اور اگر کوئی ناخالص چیز ہے وہ رد ہوگی۔ کتاب وسنت کی بنیاد پر اور منہجِ سلف کی روشنی میں محاکمہ سے کوئی چیز بالا نہ رکھی جائے گی۔ محض یہ بات کہ ایک چیز امت کے اندر 'صدیوں' سے چلی آتی ہے، اس کے قبول کرلیا جانے کی دلیل نہ ہوگی، الا یہ کہ اس کا ثبوت قرونِ ثلاثہ کے علمی ذخیروں ہی سے دے دیا جائے۔ بعد کے بزرگ بھی یقیناً بزرگ ہیں اور نہایت قابل احترام، مگر ان کی بات کو پہلے والوں کے منہج کی جانب بہرحال لوٹایا جائیگا۔

□□□□□□

تقسیم عام کیلئے، یہ مضمون علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں، سستی چھپائی کے ساتھ، دستیاب ہے

دورِ صحابہ وسلف کی
''اتباع''، نہ کہ محض 'تعظیم'!

دورِ صحابہ وسلف کی جانب دیکھنے کا انداز درست کر لینا بھی ہماری ایک اہم تحریکی ضرورت ہے۔

یہ نہیں کہ ہمارے ہاں صحابہؓ اور قرون اولیٰ کا تذکرہ کم ہوتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ صحابہؓ کا یہ تذکرہ ہوتا کس حیثیت میں ہے؟

عقیدت کے طور پر۔ سیرت کے بیان کے حوالہ سے۔ تاریخ کے حوالہ سے۔ روح افروز ایمانی واقعات کے حوالہ سے۔ رقائق کے حوالہ سے۔ زہد اور دین داری اور نیکی وتقوی کے حوالہ سے۔ فتوحات کے حوالہ سے۔ بہادری، دلیری اور جہاد کے حوالہ سے۔ کارناموں کے حوالہ سے۔ تبلیغ اسلام کے حوالہ سے۔ روافض اور باطنی انحرافات کے مدمقابل......

حتی کہ صحابہ کا تذکرہ بعد والوں کیلئے 'اسوۃ' اور 'نمونہ' کے طور پر ہونا اور صحابہ کی اقتدا کی تاکید کی جانا بھی ہمارے ہاں عموماً انہی حوالوں سے ہوتا ہے۔

رہا یہ کہ صحابہ فہمِ دین کا معیار ہیں ...... رہا یہ کہ عقائد، اعمال، تزکیۂ نفس کے طریقے اور شریعت (وطریقت) وغیرہ ایسے سب امہات الامور صرف صحابہ سے لیے جانا ہیں اور صحابہ کے مابعد ظاہر ہونے والے محدثاتِ امور کو بدعت جاننا اور ان سے احتراز اور ممانعت کی جانا ہے خواہ وہ کتنے ہی بڑے بڑے بزرگوں کے ہاں کیوں نہ پائے گئے

ہوں ...... رہا یہ کہ کتاب وسنت کے معانی اور مفہومات اور اصولِ استدلال کی بابت کسوٹی صحابہ ہیں ...... رہا یہ کہ صحابہ سنت اور بدعت کا مفرق طریق cross road ہیں ...... تو ان حوالوں سے صحابہ کا تذکرہ کبھی کم ہی سننے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔

یہاں تک کہ کوئی صاحب جہاں صحابہ کے ایمان افروز واقعات کے پرتاثیر ذکر سے دلوں کو اکثر گرماتے ہیں وہاں تعبیرِ دین کے معاملہ میں وہ کتاب وسنت سے اپنا ہی فہم پیش کریں گے اور اپنی ہی 'اقوال' سنائیں گے!

کوئی صاحب خطبہ میں بڑی پابندی سے **خیر القرون قرني، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم** کے الفاظ 'تلاوت' کریں گے مگر 'عقیدہ' اور 'طریقت' اور 'مشرب' کے معاملہ میں کل انحصار اور سب کے سب حوالے جب دیں گے دورِ آخر کے کچھ بزرگوں کے ہی دیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے ان بزرگوں پر جو لوگ انحصار نہیں کرتے ان کو تقریباً تقریباً اہل بدعت سے بھی بُرا جانیں گے!

مختصر یہ کہ قرون اولیٰ کی جانب تعظیم اور عقیدت سے دیکھنے کے باوجود ہمارا زاویۂ نگاہ درست ہو جانے میں ابھی اس اہم امر کا فقدان ہے۔ خیر القرون کو ''فہمِ دین کے معیار'' کے طور پر نہ لیا جانا ___ اسکی تمام تر تعظیم کے باوجود ___ اسلام کے زمانۂ اول کو گویا ایک سلیقہ سے طرح دے جانا ہے۔ گو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس امر کی جانب بہت سے لوگوں کی توجہ نہیں جا سکی، وگرنہ صورتحال شاید بہت مختلف اور بہت بہتر ہوتی۔

پس لازم ہے کہ صحابہ وقرونِ سلف کی جانب رجوع کا ایک صحیح ومستند اسلوب متعارف کرایا جائے، جس میں صحابہ اور ان کے تلامذہ تابعین وتبع تابعین کے معاملہ میں نہ تو ''حمیت'' مفقود پائی جائے اور نہ ''اتباع''۔

□□□□□□

دورِ اول کے ''سَلَف'' اور

زمانۂ آخر کے 'اکابرین'

ایک اور امر کا واضح ہو جانا بھی اس حوالے سے ضروری ہے۔ گو یہ اس گفتگو کا ایک نازک پہلو ہے مگر خدا شاہد ہے یہ اس موضوع کی حرمت کا تقاضا نہ ہوتا تو ہم ہرگز اس طرف نہ آتے۔

ہمارے برصغیر کے کئی ایک روایت پسند دینی طبقے اپنی روزمرہ اصطلاحات میں 'اکابرین' اور 'بزرگوں' اور 'بڑوں' کے الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اصطلاحات کے استعمال میں ہرگز کوئی مضائقہ نہیں۔ اور پھر ہر طبقے کے ہاں خود ان کے اپنے دور میں بھی بڑوں اور بزرگوں کا پایا جانا اور ان کا احترام اور التزام کیا جانا بے حد مستحسن ہے، بلکہ ضروری۔ مگر اس کے باوجود بعض امور میں کسی خلط کا پایا جانا معاملے کو پیچیدہ کر دیتا ہے۔ 'سَلَف' کی اصطلاح جو کہ اصولِ اہلسنت کا ایک اہم سنگ میل ہے ابھی پچھلی فصول کے اندر بیان ہو چکی ہے۔ کیا 'بزرگوں' اور 'بڑوں' اور 'اکابرین' کے الفاظ سے ہمارے ان قابل احترام حضرات کے نزدیک عین وہی مراد ہے جو اصولِ اہلسنت میں 'سلف' سے لی جاتی ہے؟

ہمارے اس سوال کے اٹھانے کا باعث یہ ہے کہ جس کثرت سے ان حلقوں میں لفظ 'اکابرین' وغیرہ استعمال ہوتا ہے اور جس کثرت سے اکابرین کی اتباع اور ان کے طریقے کو لازم پکڑ لینے کی تلقین اور تذکیر اِن کے یہاں کی جاتی ہے اور اکابرین کا

راستہ ہاتھ سے چھوٹ جانے کے معاملہ میں جس شدت کے ساتھ اِس مکتبِ فکر کے حلقوں میں تخویف اور تحذیر کرائی جاتی ہے، اس کو دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس کا اصل محل درحقیقت اُمت کے سلف کو ہونا چاہیے۔ ہماری اس بات سے اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہے تو بخدا ہم اس پر معافی کے خواستگار ہیں مگر ہماری اس بات پر براہِ کرم غور ضرور کیا جائے۔

جہاں تک ان حلقوں کے ہاں ان الفاظ کے اطلاق کا تعلق ہے تو یہ سمجھ آنا کچھ مشکل نہیں کہ 'اکابرین' اور 'بزرگوں' کے الفاظ یہاں کچھ ایسے قابلِ قدر فضلاء کیلئے بولے جاتے ہیں جو آج سے کوئی پچاس یا سو سال پہلے پائے گئے یا زیادہ سے زیادہ جو پچھلی دو تین صدیوں میں یہاں برصغیر میں ہو گزرے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ 'اکابرین' اور 'بزرگوں' ایسے الفاظ سے ان حضرات کے ہاں اُمت کے سلف بہرحال مراد نہیں لئے جاتے۔

روایت پسندی بلاشبہ ایک مستحسن بات ہے اور دورِ آخر کے بزرگوں کا ادب بھی بلاشبہ قابل تحسین ہے مگر روایات اور بزرگوں کا یہ سارا سلسلہ آخر پچھلے سو دو سو سال پر ہی کیوں محیط ہے؟؟؟

بزرگوں کے راستہ پر چلنے کی تلقین کی جانا بھی حرج کی بات نہیں۔ دورِ آخر کے بزرگوں کو بزرگ ماننے میں ظاہر ہے کیا مضائقہ ہو سکتا ہے؟ کوئی بات قابل فکر ہے تو وہ یہ کہ ''دورِ آخر کے اکابرین'' کے چھوڑے ہوئے طریقے اور راستے کا پابند رہنے کی صبح شام جہاں اس قدر تذکیر ہوتی ہے وہاں ''دورِ اول کے سلف'' کے چھوڑے ہوئے طریقے اور راستے کے حوالے دیا جانا اور ان کا پابند رہنے کی تذکیر کی جانا تو پھر اس سے ہزار ہا گنا بڑھ کر ہونا چاہیے۔ مگر کیا ایسا ہوتا ہے؟

اپنے اکابرین کا سلسلہ اگر پچھلے دو تین سو سال پیچھے تک ہی جا پاتا ہے تو سلف کے دور تک آپ کیونکر پہنچیں گے؟

ہمارا سوال اصل میں دورِ آخر کے سلف کا التزام کیا جانے کے 'تذکرہ' پر نہیں بلکہ ہمارا سوال دورِ اول کے سلف کا التزام کیا جانے کے 'عدم تذکرہ' پر ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ 'سلف' کا تصور تو ہو مگر وہ اپنے محل پر نہ رہنے دیا گیا ہو؟ یعنی 'سلف' کا تصور کوئی دس بارہ صدیاں نیچے سرک آیا ہو؟

اگر ایسا ہے تو 'اوپر چڑھنے' کا عمل ہمیں پھر سے ایک بھرپور زور لگا کر اور شاید بہت کچھ برا بھلا سن کر از سر نو شروع کرنا پڑے گا۔

پھر ایک اہم غور طلب بات تو یہ ہے کہ پچھلی چند صدیاں دراصل اپنے زوال کی صدیاں ہیں۔ ان میں جو رجحانات ایک بڑی سطح پر عام ہوئے وہ تو بطور خاص تنقیح کئے جانے کے قابل ہیں۔ اس کیلئے بھی کسوٹی ہمارے پاس وہی سلفِ اول کا منہج ہے جس پر دورِ آخر کے سب رجحانات اور یہاں پائے جانے والے سب ایجابیات وسلبیات کو پیش کیا جانا ہے۔ (شخصیات اور افراد کا محاکمہ البتہ ہمارا موضوع ہے اور نہ ہماری دعوت)

قرونِ خیّرہ کے گزر جانے کے بعد اہلسنت کے بعض طبقوں کے ہاں سنت اور بدعت کے خطوط کئی مقامات پر گڈمڈ ہوئے ہیں۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، جیسا کہ اس پر کچھ بات ہو چکی ہے۔ پھر ہم جانتے ہیں یہ خلط شدہ اُمور صدیوں سے چلتے اور منتقل ہوتے بھی آئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اشعری اور ماتریدی عقیدہ کے وہ پہلو جو عقلیات اور تاویلِ صفات سے تعلق رکھتے ہیں اور آج تک ہمارے بہت سے مدارس میں سبقاً سبقاً پڑھائے جاتے ہیں اور پھر نقشبندی و چشتی وسہروردی طریقہ ہائے عبادت وروحانی اعمال کیا ابوبکرؓ وعمرؓ اور ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ وغیرہ ایسی اسلام کی نسلِ اول سے مروی ہیں یا عمر بن عبدالعزیزؒ اور مجاہدؒ اور عکرمہؒ اور قتادہؒ اور نخعیؒ وغیرہ ایسی اسلام کی نسل دوئم سے ماثور ہیں اور یا پھر ابوحنیفہؒ، مالکؒ، ثوریؒ، ابن عیینہؒ، شافعیؒ، اوزاعیؒ، ابن حنبلؒ اور بخاریؒ وغیرہ ایسی نسل سوئم کے علمی ذخیروں سے ثابت ہوتے ہیں...... یا پھر یہ اشیاء پہلے تین زمانے گزر جانے کے بعد امت میں دیکھی جانے لگیں؟؟؟

قرونِ ثلاثہ کے مابعد نیا جو کچھ آیا اور پرانا جو کچھ پس منظر میں چلا گیا وہ کسی ایسے جائزہ اور محاکمہ سے بالاتر نہیں جو منہجِ سلف کی روشنی میں ایک بے لاگ انداز کے ساتھ کیا جاتا رہے۔

کتاب وسنت کا وہ استنباط اور استخراج اور فہم اور تطبیق جس کے مجموعی طور پر درست اور قابل اعتماد ہونے کی ہمیں شریعت میں یقین دہانی ملتی ہے وہ صحابہ کا استنباط اور استخراج اور فہم ہے۔ رہے آخری صدیوں میں مقبول اور مشہور ہو جانے والے سلسلے تو وہ البتہ شریعت میں ایسی کوئی ضمانت نہیں رکھتے جس کی رو سے ہم ہر حال میں ان کو صحیح ماننے نیز ان کو کسی تنقیدی نگاہ سے نہ دیکھنے کے ہی شرعاً پابند ہوں اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں ہمارے ایمان کو خطرہ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔ ہاں جس بات پر ایمان کو خطرہ لگ جانے کا اندیشہ ہو جانا چاہیے وہ یہ کہ آدمی جانتے بوجھتے ہوئے دیانت اور عدل کا دامن محض رجال کی تعظیم میں ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے یا یہ کہ آدمی ہر معاملے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو حکم بنانے سے احتراز کرے یا یہ کہ آدمی صحابہ کے راستے پر کسی اور راستے کو ترجیح دینا یا اس میں کچھ کمی بیشی ہو جانا قبول کر لے۔

کسی چیز کی تعظیم میں خاموش ہوا جا سکتا ہے تو وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے اور یا پھر خیر القرون کا فہمِ اسلام۔ اس کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر بات نہ ہو سکے۔

کیا ایسا تو نہیں کہ جس ظاہرہ Phenominon کا پیچھے ہم ذکر کر آئے ہیں اور جو کہ ہمیں آج کے پڑھے لکھوں کے ہاں بکثرت نظر آتا ہے یعنی ''پرانی روش سے جتنی ہٹ کر بات کی جائے وہ ان کو اتنی ہی 'مبنی بر تحقیق' معلوم ہوتی ہے'' اس کا ایک سبب بھی (واضح رہے صرف ایک سبب) یہی ہو کہ برصغیر کی پچھلی چند صدیوں کا جمود ہمارے اس جدید پڑھے لکھے طبقہ کو قبول کر لینا دشوار ہوا اور وہ اس سے کسی بھی طرح چھٹکارا پانے کی فکر میں ہوں اور یہی ذہنیت ___ ایک بے علمی کے سبب ___ ان کو پھر ان جدت پسند رجحانات کی جانب دھکیل رہی ہو جو کتاب وسنت [۱] سے دین کی تعبیر کرنے کے

(۱) بلکہ ان جدت پسندوں میں سے کئی ایک تو صرف قرآن سے ہی 'اپنی سمجھ کے مطابق' دین اخذ کرنے کو کافی جانتے ہیں۔

معاملہ میں بنیادی طور پر کسی بھی قید سے آزاد ہیں اور جو کہ سلف سے خلف تک سب کو بلا امتیاز لتاڑ دیتے ہیں۔

اگر ایسا ہے تو اس صورتحال کا شکوہ پھر کیا صرف آج کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے کیا جائے؟ مزید یہ کہ آج کے اس تعلیم یافتہ طبقہ کو جدت پسندی کے خطرناک مضمرات بتا کر اور اس معاملہ میں عاقبت کی فکر کرا کر وقت کے ان جدت پسند رجحانات سے برگشتہ اگر کر بھی لیا جائے (جس کے کہ ہم بھی مؤید ہیں اور اسی کیلئے کوشاں) تو کیا اس جدت پسندی سے برگشتہ کرا کر ان کو پھر انہی جامد وسکہ بند رجحانات کا ازسرنو پابند کیا جائے گا جو کہ پہلے ہی ان کے اس ردعمل کا سبب بنے رہے ہیں اور جن کی کل تاریخ دورِ زوال کی پچھلی چند تاریک صدیاں ہیں نہ کہ سلف کا دورِ تابندہ!؟

آخر راستہ کہاں سے کھلتا ہے؟ پچھلے ایک عرصہ سے ہم واقعتاً ایک بند گلی پر پہنچ چکے ہیں اور شاید غلط جگہ پر زور لگا رہے ہیں۔ 'جدت پسندی' کا خاتمہ کیا جانے کا مطلب پچھلی دو تین صدیوں کے بزرگوں کا پابند ہو رہنا ہو، اور ان بزرگوں کی پابندی سے آدمی نکلے تو پھر جدت پسندی اس کی منتظر ہو!...... جبکہ سَلَف کے راستے کی پابندی[1] یہاں کی

(۱) 'سلف کے راستے پر چلنے' کی صدا بھی ایک عوامی طبقے کی جانب سے گو یہاں بلند کی جاتی ہے، مگر (اساتذۂ علم کی ایک محدود تعداد کو چھوڑ کر) خود اس صدا کے اندر جو خلط مبحث اور غلطی ہائے مضامین پائے جاتے ہیں، اور خود یہ صدا جس طریقے سے کچھ فقہی اور فروعی بنیادوں پر فرقہ وارانہ رجحانات کی پرورش کر رہی ہے، اور جو کہ خود ''منہجِ سلف'' سے ہی براہِ راست تصادم ہے...... یہ سب منہجِ سلف کے حق میں بے اندازہ نقصان کا باعث بنا ہے، یہاں تک کہ دیکھنے پڑھنے والے یہ باور کرنے لگے کہ ''سلفیت'' گویا 'حنفی'، 'مالکی'، 'شافعی' اور 'حنبلی' کے مقابلے میں کچھ خاص 'امتیازی مسائل' پر مبنی ایک مذہب ہے!!! حالانکہ ''سلفیت'' اس سے کہیں وسیع تر ایک حقیقت ہے۔ یہ مذاہب اربعہ کو شامل ہے نہ کہ مذاہب اربعہ کے مغایر کوئی چیز۔ یعنی ایک آدمی فقہی اعتبار سے 'حنفی' یا 'شافعی' یا 'حنبلی' ہوتے ہوئے، اپنے عقیدہ ومنہج کے اعتبار سے سلفی ہوسکتا ہے۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ امام طحاوی حنفی ہوتے ہوئے سلفیت میں امام کا رتبہ رکھتے ہیں، ابن ابی العز حنفی، شرحِ عقیدہ میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ابنِ قدامہ اور ابن رجب حنبلی ہوتے ہوئے اور ابن حجر اور نووی شافعی ہوتے ہوئے منہجِ سنت وسلف کے امام ہوسکتے ہیں۔ پس منہجِ سلف تو وہ چیز ہے جس پر تمام اہلسنت طبقے اپنا تمام تر فقہی تنوع برقرار رکھتے ہوئے اکٹھا ہوسکتے ہیں۔

فکری دنیا میں آدمی کیلئے کوئی آپشن ہی نہ ہو! کیا ہم جدت پسندی کے راستے بند کر کر کے یہاں کے پڑھے لکھوں کے سامنے سب راستے تو بند نہیں کر رہے؟ راستہ تو ایک ہی ہے جو آخر تک کھلا ہے اور جو کامیابی اور منزل پر پہنچنے کی ضمانت ہے، باقی تو سب راستے ہی کہیں نہ کہیں بند ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ راستہ تو، جس کا یہاں ذکر ہے، بند ہوا تو اپنے ہاں جدت پسندی کی یہ نوبت آئی! بلاشبہہ ہمارے یہ سبھی راستے جو متاخرین کے چلائے ہوئے ہیں اور جن پر جمود کے باعث ہم منہجِ سلف کی روشنی میں ان کی تنقیح ومحاکمہ کرنے پر آج بڑی حد تک آمادہ نظر نہیں آتے، یہ سبھی راستے بلاشبہہ ایک عرصہ سے بند ہیں اور یہ ہمیں ہرگز کہیں نہیں پہنچا رہے۔ امام مالکؒ کا ایک قول جو بے انتہا مشہور ہے اور سنہری حروف سے لکھا جانے کے قابل:

لن يصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها

''اِس اُمت کا آخر بھی عین اسی امر پہ آنے سے سدھرے گا جس پہ آ کر اس کا اول سدھرا تھا''۔



کوئی چیز کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا متبادل نہیں

''فہمِ سلف'' جتنا بھی قیمتی اور ضروری ہے ''کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ'' کا قائم مقام بننے کیلئے نہیں ہے۔ ''قرآن'' کو علم اور ایمان اور تحریک کا موضوع بنانا اور ''سنت'' کو اُمت کی اس نئی اٹھان کی بنیاد بنانا بہر حال اپنی جگہ فرض ہے اور اُمت کی ایک بڑی ضرورت۔ ''فہمِ سلف'' اس عمل کیلئے ایک اوزار tool کا کام دے گا مگر خود اس عمل ــــ یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ پر شبانہ روز محنت ــــ کی اہمیت اپنی جگہ باقی رہے گی۔

اس بنا پر وہ سکہ بند جامد رجحانات جو کہ اپنے منہجِ تربیت اور اپنے منہجِ تحریک میں اصل انحصار کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ پر نہیں کراتے.. جو ایک عام آدمی کے قرآن اور سنت کو محض ہاتھ لگانے کیلئے ان علوم اور فنون کی ایک طویل فہرست گنوانے بیٹھ جاتے ہیں جو کہ صرف ایک 'مجتہد' کی ضرورت ہیں نہ کہ ایک 'طالب علم' کی...... جو مذہبی رجحانات وقت کے انسان کو وحی کی نصوص میں غوطہ زن نہیں کراتے اور جو مصادرِ دین کا کوئی 'آسان متبادل' دینے پر ہی اصرار کرتے نظر آتے ہیں......تو دراصل یہ وہ رجحانات ہیں جن کو آپ اس معاملہ میں دوسری انتہا کہہ سکتے ہیں بلکہ اس ردعمل کا اصل سبب بھی جو کچھ لوگوں کے اول الذکر انتہا پر جانے کا باعث بنتا رہا ہے۔

اصل نصاب ہمارے ایمان اور عمل کیلئے خدا کی کتاب ہے اور اس کے رسولؐ کی سنت۔ ہاں البتہ اس کو پڑھنا ہمیں سلف سے ہے اور اس کے پڑھنے میں سلف کے فہم اور طریقہ سے ہرگز مستغنی نہیں ہونا اور نہ ہی اس میدان میں 'خود کفیل' ہونے کا کوئی زعم رکھنا ہے۔ مگر یہ کہ 'شرح' ہی ''متن'' سے کفایت کر جائے، ''اصل نصاب'' کہیں پس منظر میں ہی چلا جائے اور صرف 'ٹیسٹ پیپر' چلیں!......تو یہ منہج بھی نہ صرف غلط ہے اور ہم کو مصادرِ دین سے ہی غافل کر دیتا ہے بلکہ سب سے پہلے یہ سلف ہی کے طریقے سے متصادم ہے۔

یہ سوچ کہ بزرگوں نے کتاب وسنت سے جو نچوڑ نکالنا تھا وہ نکال لیا ہے اور ایک بڑی سطح پر بس اب ہم کو بزرگوں پر ہی انحصار کرنا ہے، نسل درنسل اب قیامت تک ہمیں انہی کا التزام کرنا اور انہی کی دہرائی ہوئی عبارتیں دہراتے رہنا ہے.. یہ طرزِ عمل یا اندازِ فکر بھی اول الذکر (جدت پسند) انتہاء کی نسبت کچھ کم خطرناک اور کم مہلک نہیں۔

کتاب اور سنت کا 'نچوڑ نکال' لینے کا کیا مطلب؟؟؟ یہ تو وہ چشمہ ہے کہ اس سے جتنا بھی نکالا جائے اس کی سطح ذرہ بھر نیچی نہ ہو۔ زمانے اس سے سیراب ہولیں اس میں کچھ بھی کمی نہ آئے۔ اور پھر اس کی تازگی کا تو کوئی بدل ہی نہیں۔ اشرف المخلوقات کی پیاس ہر دور میں ایمان کے صرف اس منبع سے بجھ سکتی ہے۔ کوئی چیز بھی اس کا 'متبادل' نہیں۔ کسی چیز کو اس کا نعم البدل ماننا یا عملاً ایسا تاثر دینا، احسنِ تقویم میں پیدا کی جانے والی اس مخلوق کے رتبہ سے فروتر ہے۔ انسان کی یہ تاریک دُنیا صرف آسمان کی روشنی سے ہی جلا پاسکتی ہے۔

سلف کا فہم اور سلف کا منہج تو جس چیز کا نام ہے وہ اس وحی کے چشمہ سے سیراب ہونے کا ہی دراصل وہ ادب اور طریقہ ہے جس کے بغیر اس چشمہ سے انسان کو شفا اور سیر یابی ہونے کی بجائے کوئی روگ لگ سکتا ہے (یضل بہ کثیرا

ویھدی بہ کثیرا (البقرہ:۲۷)(۱) فأما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ و ابتغاء تاویلہ (آل عمران:۷)(۲) رہا یہ کہ دُنیا کی کوئی چیز انسان کو اس بات سے ہی مستغنی کردے کہ تا عمر وہ اسی چشمہ سے ہی بھربھر کر پیئے، تو اس بات کا، منہجِ سلف اور اصولِ اہلسنت سے دور نزدیک کا بھی کچھ واسطہ نہیں بلکہ یہ اس سے صاف صاف متصادم ہے۔ وحی کے سوا کوئی گھاٹ نہیں جس سے خدا کی مخلوق پیئے اور اپنی درماندگی کا مداوا کرے۔

ایک ایسا آدمی جو آپ کو بادشاہ کا پتہ دے سکتا ہے یا یقینی طور پر آپ کو بادشاہ تک پہنچا کر آ سکتا ہے ___ اپنی تمام تر اہمیت وافادیت کے علیٰ الرغم ___ کیا 'بادشاہ' کا متبادل ہوسکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہو تو اس سے بڑی محرومیت کیا ہوسکتی ہے؟!!

معاملہ یہ ہے کہ کلام اللہ ایک ایسا محیط کلام ہے کہ اس میں علم، ایمان اور حقیقت کے سمندر پوشیدہ ہیں۔ سنت، جوامع الکلم پر مشتمل ہے اور اس ذات کی وحی ہے جو وقت اور زمانے سے بلند ہے۔ ایسی جامع چیز زمین پر اس کے سوا کبھی اتری ہی نہیں۔ اصولِ سلف اس کی وسعت کو محدود کر دینے کا نام نہیں بلکہ اس کی وسعت سے مستفید اور محظوظ ہونے کے صحیح منہج کا نام ہے کیونکہ وحی کی تلقی کا یہ وہ انداز ہے جو خود صاحبِ وحی کے زیر نگاہ اور اسی کے زیر ہدایت پروان چڑھا اور جس کی سب تراش خراش صاحبِ وحی کے اپنے ہاتھوں ہوئی۔ البتہ اس میں قیامت تک کی جو ضروریات عمدگی کے ساتھ سمودی گئی ہیں وہ اپنی جگہ باقی ہیں۔ سلف نے کلام اللہ یا رسول اللہؐ کے جوامع الکلم کو معانی کے لحاظ سے محصور یا مقید نہیں کر دیا ہے۔ سلف نے کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہؐ کے فہم کے عمل کو دراصل وہ رخ دے دیا ہے جس کے نہ ہوتے ہوئے انسانی فہم منتشر اور مشتت ہوسکتا تھا اور کسی ایسی سمت میں جا سکتا

---

(۱) ''بہتوں کو وہ اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے اور بہتوں کو گمراہی''

(۲) ''پس البتہ وہ لوگ جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے تو وہ اس (کلام) کے ان حصوں کے پیچھے جاتے ہیں جو متشابہ ہوں، فتنہ کی تلاش میں اور اس کی تاویل کی تلاش میں''

تھا جو کہنے والے کا مقصود نہیں یا جو انسان کے زمین میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے میں مانع ہو۔

ہمیں جو کرنا ہے وہ یہ کہ فہمِ سلف کا استیعاب کرتے ہوئے خود اپنے دور میں خدا کی اس وحی سے ہی اپنا علمی، فکری، شعوری، تہذیبی اور واقعاتی وجود برآمد کریں البتہ اس عمل کے ہر مرحلے میں اِس کے درست ہونے کی توثیق منہج سلف سے کراتے رہیں۔

یعنی نہ 'وحی' کا کام کبھی کسی دور میں ختم ہوتا ہے اور نہ 'انسان' کا۔ البتہ اس کا فورمیٹ format وہی ہوگا جس کو منہجِ سلف یا اصولِ اہلسنت کہا جاتا ہے۔

پس یہ تین چیزیں ہیں:

- وحی، اپنی خالص حالت میں۔
- اپنے دور کا انسان، بلکہ اپنے دور کا ایک بھرپور اور جیتا جاگتا باشعور انسان۔
- اور پھر انسان کے وحی سے تعامل کرنے کا وہ درست طریق کار جو شارع کے اپنے زیر نگاہ قرنِ اول میں پایۂ تکمیل کو پہنچ کر بعد والوں کیلئے نظیر precedent کی حیثیت اختیار کر گیا۔

ہدایت پانے کا عمل انہی تین امور کا اجتماع ہے۔ ان تینوں میں سے کسی بھی چیز کا روپوش ہو جانا یا اس کا اپنی جگہ سے ہٹا دیا جانا غیر مطلوبہ نتائج برآمد کرنے کا ہی سبب بنے گا۔

□□□□□□

'مجمع' سے
''جماعت'' تک!!!

پس آپ دیکھتے ہیں: باوجود اس حقیقت کے کہ دین کا مصدر کتاب اللہ ہے اورسنت رسول اللہؐ اور جس میں کہ شک کی ذرہ بھر گنجائش نہیں...... پھر بھی یہ سوال کچھ کم اہم نہیں کہ اس کا فہم آپ کہاں سے لیتے ہیں؟ اپنے نوجوانوں کواس سوال کا صحیح جواب از برنہ کرانا ہم دیکھ چکے کتنے خطرناک مضمرات کا حامل ہے۔

وہ سب طبقے جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کو دین کا مصدر ماننے پر متفق ہیں، جن میں کہ مذاہبِ اربعہ سے منسوب آج کے بیشتر طوائف، جن میں سے ہمارے برصغیر میں ایک بڑی سطح پر البتہ احناف پائے جاتے ہیں اور بہت محدود سطح پر شوافع، اور پھر اہلِ حدیث اور اہلِ ظاہر کے تقریباً سب مکاتب فکر آجاتے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم ان سب طوائف کو اہلسنت شمار کرتے ہیں اور برصغیر میں انکے وجود کو ایک بڑا سرمایہ خیال کرتے ہیں...... ہم یہ واضح کر آئے ہیں کہ منہجِ سلف کے احیاء کی صورت میں یہ سب طبقے کیونکر ایک ہی شجر سے پیوستہ ہوسکتے ہیں اور ایک بہترین انداز میں اسی ایک شجر کے قدرتی پھیلاؤ کی صورت دیکھے جاسکتے ہیں۔

گو اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہمارے یہ طبقے جو تاریخی طور پر اہلسنت شمار ہوتے ہیں یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کو ہی دین یا دین کا مصدرِ مطلق ماننے والے اصحاب ...... ہمارے ان طبقوں میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کو سمجھنے اور اس پر عمل

پیرا ہونے کے سلسلے میں اس وقت جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ کسی بعد المشرقین سے کم نہیں، اور یہ کہ ہر ایک اپنے ہی طریقے کو معیارِ حق ماننے میں شدت کے آخری درجے پر جانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیں یہ اندازہ ہے کہ اس کتابچہ کی صورت میں بلکہ عمومی طور پر ایقاظ کی اپروچ متعارف کرا کر ہم کتنا ایک نازک اور دشوار موضوع چھیڑنے جا رہے ہیں۔ گو اس معاملہ میں الحمد للہ ہمیں امت کی اعلیٰ سطح کی علمی شخصیات کی راہنمائی پوری طرح حاصل ہے۔

ہمارے برصغیر کے یہ دینی طبقے، جن کو ہم اہلسنت کا ہی تسلسل مانتے ہیں، اور خود کو بھی مجموعی طور پر انہی سے وابستہ جانتے ہیں، ''دین'' کے ایک متعین مصدر پر گو متفق ہیں مگر دین کے فہم کے معاملہ میں ایک بری طرح گتھم گتھا۔ یہاں تک کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے گویا یہ مختلف ادیان ہیں۔ تاریخ کے اس آشوب ناک ترین دور میں رہتے ہوئے بھی ہمارے یہ دینی طبقے فکری یکسوئی سے بہت دور اور آپس کی ذہنی قربت اور یگانگت سے تقریباً ناواقف ہیں جبکہ فکری اور نظریاتی یکسوئی کے جتنے مواقع قدرتی طور پر ان کو، یعنی اہلسنت سے منسوب مسالک ومکاتبِ فکر کو، حاصل ہیں کرۂ ارض کی کسی اور جماعت کے ہاں اس کا تصور تک ممکن نہیں۔ بہت سے تاریخی عوامل نے برصغیر کے دینی سیکٹر کو، نشاطِ عمل کے غیر معمولی امکانات رکھنے کے باوجود، اور انتہا درجے کا جذبۂ جہاد پائے جانے کے باوجود، شدید حد تک غیر مؤثر بنا کر رکھ دیا ہے بلکہ تفرقہ اور انتشار کی ایک اندوہناک مثال بھی۔ جہاں اس کے اور کئی اسباب ہوں گے وہاں، آپ اتفاق کریں گے، مصادرِ فہم کا مسئلہ بھی اس کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

پس مستقبل کی وہ تحریک جو برصغیر کی اس زرخیزی کو عمل اور جہاد کے رخ میں ایک صحیح معنیٰ کے اندر بروئے کار لانے میں کامیاب ہوگی، اور جس کے نتیجے میں باطل کے بڑے بڑے برج یہاں الٹیں گے، اور آخر تو ان شاء اللہ یہ ہونا ہے، ''منہجیتِ فہم'' کا مسئلہ __ ایک باقاعدہ اصولی بنیاد کے ساتھ __ اس کے اہم ترین موضوعات میں

سے ایک ہوگا۔ پس یہ معاملہ ہرگز بے رغبتی برتنے یا کوئی 'ڈپلومیسی' اختیار کر رکھنے کا نہیں۔ ایک اصولی بنیاد اختیار کر رکھتے ہوئے مستقبل کی اس تحریک کو یہاں بے حد دوٹوک ہونا پڑے گا اور بے حد واضح اور صریح۔ یقین کیجئے بہت سے بند راستے یہاں کی تحریکی دنیا میں یہیں سے، یعنی اس مسئلے کو لے کر چلنے سے، کھلیں گے۔



چنانچہ آپ دیکھتے ہیں ایک طرف ہم ان طبقوں کو 'اہلِ سنت' کے طور پر لیتے ہیں، جس کی اپنی ایک دلالت ہے۔ اور دوسری طرف ہم ان کو بڑی سطح پر اور متعدد پہلوؤں سے ایک تبدیلی کے عمل سے گزرنے کا ضرورت مند سمجھتے ہیں، جس کی اپنی ایک دلالت ہے......

ہمارے مقدمے کا یہ حصہ ضروری ہے کہ بہت واضح ہو جائے......

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کچھ مانع نہ ہونا چاہیے کہ پچھلی چند صدیاں ہمارے زوال کی صدیاں تھیں۔ یہ خیال درست نہیں کہ یہ زوال ہمارے معاشروں کے ایک عام فرد پر تو آیا مگر دینی طبقے اس سے محفوظ ہی رہے۔ بلکہ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ یہ زوال پہلے یہاں کے دینی طبقوں اور علمی حلقوں پر اگر نہ آیا ہوتا تو عام فرد اس کی زد میں آتا ہی نہ۔ اس امت کے عروج اور زوال کا اصل پیمانہ تو یہاں کی دینی قیادتیں اور دینی طبقے رہے ہیں۔ اِن پر آنے والا زوال خود بخود معاشرے پر اثر انداز ہوگا اور اگر ان کا رخ بلندی کی جانب ہو جائے تو معاشرہ خود بخود ترقی کرے گا۔

چنانچہ آج یہاں جو دینی طبقے پائے جاتے ہیں اور جن کے وجود کو ہم اس وقت بسا غنیمت جانتے ہیں، ان کو اہلسنت کا تاریخی تسلسل ماننے سے ہماری یہ مراد نہیں کہ یہاں اہلسنت کا منہج پوری طرح واضح اور قائم ہے۔ جس طرح کہ آج کے مسلم معاشروں کو اُمتِ اسلام کا تسلسل ماننے سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ آج کے یہ مسلم معاشرے اسلام کی حقیقت پر پوری طرح ___ یا حتی کہ گزارے کی حد تک بھی ___

قائم ہیں۔ ایسا ہوتا تو پھر کسی بات کا رونا ہی کیا تھا! تب ہم بھی اسلامی حکومت کے قیام یا دشمن سے قتال وغیرہ کو ہی اپنی سب سے بڑی ترجیح جانتے۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں حقیقتِ اسلام اس وقت قائم نہیں بلکہ اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ معروف تک نہیں۔ لہذا ہمارے خیال میں ان مسلم معاشروں میں کسی اور بڑی مہم کی صدا بلند کرنے سے پہلے ان کو حقیقتِ اسلام کی نشان دہی کر کے دینے اور اس پہ ان کو عملاً لے آنے پر ہی کچھ وقت صرف کر دیا جانا چاہیے۔

بعینہ اسی طرح...... یہاں کے دینی طبقوں کو اہلسنت کا تاریخی تسلسل ماننے کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ان طبقوں میں کوئی بہت ہی بنیادی اور جذری تبدیلی لے آنے کی چنداں ضرورت نہیں یا یہ کہ ان میں اصولِ اہلسنت کا فقہ وفہم اجاگر کرنا ازسرنو ضروری نہیں ...... یا یہ کہ ایسا کئے بغیر ہی آناً فاناً ہم ان طبقوں میں اتحاد اور یکجہتی کی کوئی تحریک اٹھانے چلے ہیں۔

البتہ ان طبقوں کو اہلسنت ماننے کی ایک دلالت ہے۔ بعینہ جس طرح آج کے ان معاشروں کو مسلم ماننے کی ایک دلالت ہے......

مسلم معاشروں کو اسلام کا پابند ہو جانے پر تیار کرنا اور اسلام کی بنیاد پر ان کا محاکمہ کرنا، بہ نسبت ایک غیر مسلم معاشرے کے، ایک فطری امر ہے اور ایک عقل لگتی بات۔ مسلم معاشروں میں اسلام سے کتنی بھی دوری کیوں نہ پائی جائے پھر بھی یہاں اسلام کی صدا بلند ہونا اور ان کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھنے کی بات کی جانا ہرگز غیر مستحسن یا حیران کن نہ ہوگا، برخلاف ایک غیر مسلم معاشرے کے۔

بعینہ اسی طرح...... اہلسنت حلقوں میں اصولِ اہلسنت کی صدا بلند کرنا اور اصولِ اہلسنت کی بنیاد پر ان کا جائزہ لیا جانا کہیں زیادہ مستحسن اور غیر حیران کن ہوگا بہ نسبت مثلاً ایک رافضی طبقہ کے، یا کسی باطنی حلقہ کے، یا کسی نیچرسٹ، یا سیکولرسٹ مکتبِ فکر وغیرہ وغیرہ کے۔

چنانچہ ہمارے یہ دینی طبقے جو مجموعی طور پر اہلسنت کا تاریخی تسلسل ہیں اور جن سے ہماری خدا واسطے کی محبت اور وابستگی ہے...... ان کو اہلسنت ماننے کے باوجود یہ تسلیم کرنے میں البتہ ہمیں کوئی تامل نہیں کہ وہ زوال جو پچھلی کئی صدیوں پر محیط رہا ہے اس کی زد ہمارے ان دینی طبقوں پر بھی بری طرح پڑی جو یہاں اہلسنت کے علمی اور فکری ورثے کے امین ہیں۔ بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ اس زوال کی زد اصل میں تو پہلے ان طبقوں پر پڑی تو تب ہی پوری اُمت اس بڑی سطح پر اس کی زد میں آئی۔ کیونکہ یہ طبقے ہی اس اُمت کی امامت اور قیادت پر فائز تھے جبکہ کسی قوم کا امام اس کی ڈھال بھی ہوتا ہے (انما الإمام جُنة يقاتل من ورائه، ويتقىٰ به – متفق علیہ) ڈھال ہی کارگر نہ رہے تو کوئی فرق تو ہے جس کا کہ آنا پھر ناگزیر تھا!!!

پس یہ انحطاط جو آج امت کو درپیش ہے اصل میں تو ہمارے اِن دینی طبقوں کے زوال کی کہانی ہے۔ اُمت اسلام پر آنے والی یہ پسپائی اصل میں تو ان طبقوں کی پسپائی ہے جو آج اس وقت اہلسنت کے باقیاتِ صالحات شمار ہوتے ہیں۔

اُمتِ اسلام پر زوال آنے کا باعث پس ہمارے نزدیک یہ نہیں کہ یہاں کے ''بے دین'' یا یہاں کے ''بدعتی'' زوال کا شکار ہوئے! اس اِدبار کا سبب یہ نہیں کہ یہاں کے ''باطنی'' یا ''رافضی'' یا یہاں کے ''قبر پرست'' یا یہاں کے ''ملحد اور زندیق'' یہاں معاشرے کے اندر اپنا وہ کردار ادا کرنے میں ناکام ہوئے جو وہ اس سے پہلے اُمت کے بھلے دور میں کبھی ادا کرتے رہے تھے تو تب ہم پر پسپائی اور کسمپرسی کی یہ آفت پڑی! بے شک اُمت کے دورِ عروج میں بھی یہ منحرف طبقے کم یا زیادہ پائے گئے ہوں اور اس کے وجود کو گھن کی طرح کھانے کیلئے کوشاں بھی رہے ہوں مگر جب تک اہلسنت اُمت کے جسم میں خون کے مرض کش جسیمے بن کر دوڑتے رہے تب تک مرض کے یہ سب جراثیم ایک بڑی سطح پر بے اثر ہی رہے۔ مگر ان صحت افزا جسیموں کا کام نرم پڑتے ہی ایک طبعی امر تھا کہ تباہی کے یہ اندرونی عوامل پوری شدت سے اُمت کے

وجود پر حملہ آور ہوتے اور اپنا تباہ کن کردار جو اس سے پہلے ادا کرنے میں یہ ناکام رہے دندنا کر ادا کرنے کا اب پوری طرح موقعہ پاتے۔ تب اس گھن کے کھائے ہوئے وجود کو جو اندر سے بودا ہو چکا تھا تباہی کے ''بیرونی اسباب'' کا سامنا کرنا بھی دشوار ہونے لگا اور تب یہ ہوا کہ پچھلی دو صدیوں میں یہ پچھّم سے اُٹھنے والے اِن طوفانی جھکڑوں کی تاب لانے میں بالآخر ناکام رہا۔

چنانچہ اس اندوہناک کہانی کی اصل کڑی نہ تو گھر کے ''منحرف'' ہوئے اور نہ باہر کے ''حملہ آور''، باوجود اس کے کہ دونوں کا کردار تباہ کن تھا اور ابھی تک ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ تباہی کے اندرونی اور بیرونی عوامل تو کم وبیش ہر وقت ہی موجود ہوتے ہیں۔ اصل سوال تو آپ کی ''قوتِ مدافعت'' کا ہے۔ تباہی کے اندرونی یا بیرونی عوامل بظاہر چاہے نظر نہ آئیں مگر بالفعل وہ کسی بھی وقت روپوش نہیں ہوتے۔ یہ خدا کی سنت ہے۔ خدا نے یہ دُنیا ایسی بنائی ہی نہیں جہاں تعمیر اور تخریب کے عوامل باہم برسرِ جنگ نہ ہوں۔ ایک صحت مند ترین جسم بھی اس بات کی ضمانت نہیں کہ مرض بردار عوامل اس کے پاس تک نہ پھٹکیں گے۔ صحت مند جسم کی یہ تعریف درست نہیں کہ اس پر بیماری کے جرثومے سرے سے حملہ آور نہ ہوں! بلکہ ''صحت مندی'' کی تعریف ہم یہ کرتے ہیں کہ یہ وہ جسم ہے جس سے ٹکرا کر بیماری کے جرثومے پسپا یا بے اثر ہو جانے پر مجبور ہوں، جس میں مرض کُشی کی صلاحیت زیادہ ہو اور جو قوت کے عوامل کی افزائش زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہو۔ جبکہ لاغر جسم وہ ہے جس میں بیماری کے عوامل کے خلاف مزاحمت نرم پڑ جائے اور جو غذا کو قوت میں تبدیل کرنے سے قاصر ہونے لگے۔

نبوت کی روشنی پہ قائم وہ حسین واقعہ جس کو اس اُمت کی تاریخ میں ''اہل سنت'' کے نام سے پہچانا گیا یہ دراصل اس اُمت کے جسم کی اسی ''صلاحیت'' کا ہی دوسرا نام ہے جو اس کے ''مرض کشی'' کی اہلیت رکھنے اور ''قوت کے عوامل کی برابر افزائش کرتے رہنے'' سے عبارت ہے۔ یہاں اصل فرق اگر کہیں آیا تو وہ اسی حسین واقعے کا اُمت کی

سطح پر سمٹ جانا اور حاشیائی ہو جانا ہے۔ باقی سب واقعات جتنے بھی اہم اور سنگین مانے جائیں، اس کی نسبت اضافی اور ثانوی ہی رہیں گے۔

یہ ان طبقوں پر، جو اہلسنت کے باقیات شمار ہوتے ہیں، اگر کوئی تنقید ہے تو بیک وقت ان کی ایک غیر معمولی تعظیم بھی ہے۔ یہ ایک ناکامی کا ذکر ہے تو ایک ایسے کردار کا تذکرہ بھی ہے جو انہی کے ادا کرنے کا ہے اور جس کو ادا کرنا کرۂ ارض کے کسی اور طبقہ کے حصہ میں نہیں آ سکتا۔ یہ ایک کوتاہی کا تذکرہ ہے تو ایک شان کا بیان بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو یہ کوتاہی کوئی چھوٹی کوتاہی ہے اور نہ اس شان کے بیان میں ہی ہرگز کوئی مبالغہ ہے۔ نقد criticism کا عمل دراصل منقودہ criticised person کے مقام کا تعین بھی ہوتا ہے!

□□□□□□

چنانچہ یہ تو ایک واقعہ ہے کہ ہمارے برصغیر کے یہ دینی طبقے ___ جو مجموعی طور پر اور ایک عمومی معنیٰ میں اہلسنت کا تاریخی تسلسل قرار دیے جا سکتے ہیں ___ آج جس نقطے پر پہنچ چکے ہیں وہ ایک شدید انتشار اور افتراق سے عبارت ہے اور دراصل اس کی پشت پر زوال اور انحطاط کی وہ کئی صدیاں ہیں جس کے دوران یہ ایک بڑی سطح پر اپنا وہ کردار ادا کرنے سے قاصر رہے جو ان کے مقام کے شایان تھا اور جس کے دوران یہ اگر مصروف عمل رہے بھی تو کچھ ایسے دائروں میں جو ان کی سعی کا کل میدان نہ ہونا چاہیے تھا اور یا پھر بسا اوقات تو ان دائروں میں جو صرف آپس میں الجھتے تھے اور جو ان کے آپس ہی کے جنگ وجدال سے عبارت تھے، باوجود اس کے کہ ان میں صورتحال کو بہتری کی جانب لے آنے کی مخلصانہ کوششیں بھی وقفے وقفے سے ہوتی ہی رہیں اور آج تک جاری ہیں...... البتہ ہم اس کی ایک مجموعی صورتحال پر بات کر رہے ہیں۔

جہاں تک بہتری کی جانب بڑھنے کی بات ہے تو وہ کسی جادوئی چھڑی سے ہو جانے والا کام نہیں۔ یہ کوئی ایسی پیشرفت نہیں جو دنوں کے اندر رونما ہو جائے۔ قوموں

کے احوال سدھرنے کے معاملہ میں خدا کی کچھ سنتیں ہیں جن کا تتبع ضروری ہے۔انہی کو سامنے رکھ کر لائحۂ عمل ترتیب دینا صورتحال کا واحد حل ہے۔اس کیلئے بنیادی طور پر دو چیزیں مطلوب ہیں:

۱) ایک یہ کہ وہ لائحۂ عمل خواہ طویل المیعاد ہو مگر درست ہو اور جہاں پہنچنا آپ کو مقصود ہو آپ کا وہ لائحہ عمل آپ کو وہیں پہنچا آنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۲) دوسرا یہ کہ اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے اور اس کی روشنی میں اپنے اہداف کا تعاقب کرنے کیلئے جس قدر محنت ضروری ہو اور جس قدر نوعی اور عددی قوت درکار ہو اور جس قدر اس کے لئے صبر واستقلال مطلوب ہو اس کا بہم پہنچانا یقینی بنایا جائے۔

اور توفیق ہر دو معاملہ میں خدا سے طلب کی جائے۔

یہ دو باتیں ویسے دُنیا میں کسی بھی ہدف کو حاصل کرنے کیلئے ضروری ہیں اور ہم بھی اس سے مستثنٰی نہ ہوں گے۔البتہ ہمارا دین ہمارے لئے اس معاملہ میں اُمید اور یقین کا ایک اور دریچہ بھی کھول دیتا ہے۔اور وہ یہ کہ آپ کا ___ تن دہی کے ساتھ ___ کسی حق راستہ میں پایا جانا ضروری ہے نہ کہ واقعتاً کسی ہدف تک پہنچ لینا۔دلجمعی اور اطمینانِ قلب کی یہ نعمت صرف ہمارے ہی دین کا خاصہ ہے۔سو اس نعمت سے بھرپور حظ اُٹھانے کا شعور پیدا کیا جانا بھی ازحد ضروری ہے۔ایک درست راہ میں آگے بڑھتے ہوئے آدمی کا نتائج سے بے نیاز ہو جانا دلجمعی اور حوصلہ مندی کی آخری حد تک جا لینا ہے۔عمل کی ایسی 'جنونی' بنیاد بھلا کس نظریہ کو حاصل ہے؟ لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے دین نے ہمارے لئے اس کا بھی بدرجۂ اتم انتظام کر دیا ہے...... **ان اللّٰہ لا یضیع أجر المحسنین!!!**

اس بہتری اور ''تبدیلی'' کی جانب بڑھنا اور اس کی صدا دینا ایک وسیع موضوع ہے۔ہمارے پیش نظر اس کتابچہ میں جس بات پر گفتگو کرنا تھا وہ ''فہم دین کے مصدر کی درستی اور اس امر میں مطلوبہ معیار اور یکسوئی کا پیدا کیا جانا'' ہے، جو کہ

بہرحال اس مطلوبہ 'بہتری' اور 'تبدیلی' کا ایک اہم حصہ اور ایک اہم پہلو ہے۔

پس مصدرِ فہم کا موضوع، اپنے یہاں کے سنجیدہ اور فعال دینی عنصر کو، اسلام کے ''دورِ اول والی بنیاد'' پر لانے کا ایک پہلو ہے۔ گو یہ صرف ایک پہلو ہے اور ''دورِ اول والی بنیاد'' کو اپنی تحریکی دنیا کے اندر ازسرنو اٹھایا جانا یقیناً اور کئی پہلو رکھتا ہے، لیکن اگر آپ یہ کتابچہ پڑھ آئے ہیں تو شاید اتفاق کریں کہ فہم کے مراجع کو ''دورِ سلف'' تک پیچھے لے جانا اور اپنا ایک تسلسل وہیں سے برآمد کراتے ہوئے، 'گروہی' انداز سے بلند ہوکر ''امت'' کی سطح پر آنا اس عمل کا ایک نہایت اہم حصہ ہے۔

□□□□□□

تمت بحمد الله تعالیٰ، فالحمد لله أولاً وآخراً......

وصلى الله تعالیٰ علیٰ نبيه، وعلیٰ آله، وصحبه، ومن تبعهم باحسان الیٰ يوم الدين،

اللهم اهدنا الصراط المستقيم، صراط الذين أنعمت عليهم، غير المغضوب عليهم ولا الضالين.

آمیـــــــــــــــن!!!

شجر سلف سے پیوستہ، فضائے عہد سے وابستہ

مطبوعاتِ ایقاظ

روزِ غضب زوالِ اسرائیل پر انبیاء کی بشارتیں، توراتی صحیفوں کی اپنی شہادت	ڈاکٹر سفر الحوالی
روبہ زوال امریکن ایمپائر عالم اسلام پر حالیہ صلیبی یورش کے پسِ منظر میں	حامد کمال الدین
مسجدِ اقصیٰ، ڈیڑھ ارب مسلمانوں کا مسئلہ (کتاب وآڈیو)	حامد کمال الدین
مسلم ہستی کا احیاء	حامد کمال الدین
دعوت کا منہج کیا ہو؟	محمد قطب
ایمان کا سبق	حامد کمال الدین
شروط لا الٰہ الا اللہ	حامد کمال الدین
نواقضِ اسلام	حامد کمال الدین
توحید کے تین اساسی محور	حامد کمال الدین
موحد تحریک	حامد کمال الدین
آپ کے فہم دین کا مصدر کیا ہے؟	حامد کمال الدین
اہل کتاب سے برأت	ڈاکٹر سفر الحوالی
صیام اور بندگی کے معانی (کتاب وآڈیو)	حامد کمال الدین
یہ گرد نہیں بیٹھے گی!	حامد کمال الدین
یہ وہی انگریزی نظام ہے، مگر اب یہ 'اسلامی' بھی ہے!	حامد کمال الدین

کتب خانوں، یا ہم سے بذریعہ وی پی طلب فرمائیے، انٹرنٹ پر بھی دستیاب www.eeqaz.com, www.eeqaz.org

شجرِ سلف سے پیوستہ، فضائے عہد سے وابستہ

سہ ماہی ایقاظ

خصوصاً اِن موضوعات کے مطالعہ کیلئے:

☆ ایمان، عقیدہ، فکر، منہج، تربیت...... جو کہ بصیرت کی اساس ہیں

☆ ولاء اور براء...... جو کہ مسلم شخصیت کی پہچان ہیں......

☆ امتِ اسلام میں اخوت اور وحدت کے پنپنے اور انسانوں کے گرد کھڑی کردی گئی سب سرحدوں کو بے وقعت کردینے کی دعوت، سوائے اُن 'حدوں' کے جو معبود کے تعین اور طرزِ حیات کے چناؤ سے وجود میں آتی ہیں

☆ تحریک، سماجی تبدیلی، تہذیبی پیش رفت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، دعوت، تعلیم،...... باطل، شرک، ابتداع، فسق اور انحراف کے جملہ مظاہر کی تردید ومخاصمت، جاہلیت سے دوبدوئی...... جو کہ جہاد کے کچھ اہم ابواب ہیں

☆ انسانی رشتوں کا پاس، محروم، نادار، پسے ہوئے طبقے کی خیر خواہی اور اعلیٰ قدروں کی ترویج...... جو کہ مکارمِ اخلاق کے کچھ اہم مندرجات ہیں

- ایقاظ ایک منبر ہے اُس مبارک مشن میں تحریری شمولیت کیلئے جس کا مقصد آج کے اسلامی تحریکوں سے وابستہ نوجوانوں کو عقیدہ کے ایک اصیل متوازن منہج سے آراستہ اور ایک ٹھوس فکری اہلیت سے لیس کردینا ہے اور اہلسنت گروہوں سے وابستہ تحریکی وجہادی وسماجی عمل کو فکری وثقافتی پہلوؤں سے مضبوط کردینا

- ایقاظ ایک کاوش ہے جذبہ کو بصیرت میں مدغم کردینے اور عمل کو علم سے برآمد کرنے کا منہج سامنے لانے کی

- ایقاظ ایک صدا ہے یہاں کے علمی ودعوتی حلقوں میں اس فقہِ اختلاف اور فقہِ ائتلاف کو زندہ وبحال کرنے کی جو کہ اہلسنت کا ایک امتیازی خاصہ اور ان کی قوت کا تاریخی راز ہے، اور جس کے عام ہوجانے سے حق کی قوتیں اپنے آپس کے وہمی معرکے ختم کرکے ایک نئے سرے سے متحد وصف آرا ہوں گی اور اتحاد ویکجہتی کے وقتی وسطحی وغیر طبعی مظاہر سے نجات پائیں گی۔

336 D سبزہ زار، لاہور 0323-4031624
www.eeqaz.com